رضا علی عابدی
مجھے سب یاد ہے
ایک نوعمر لڑکے کی روداد
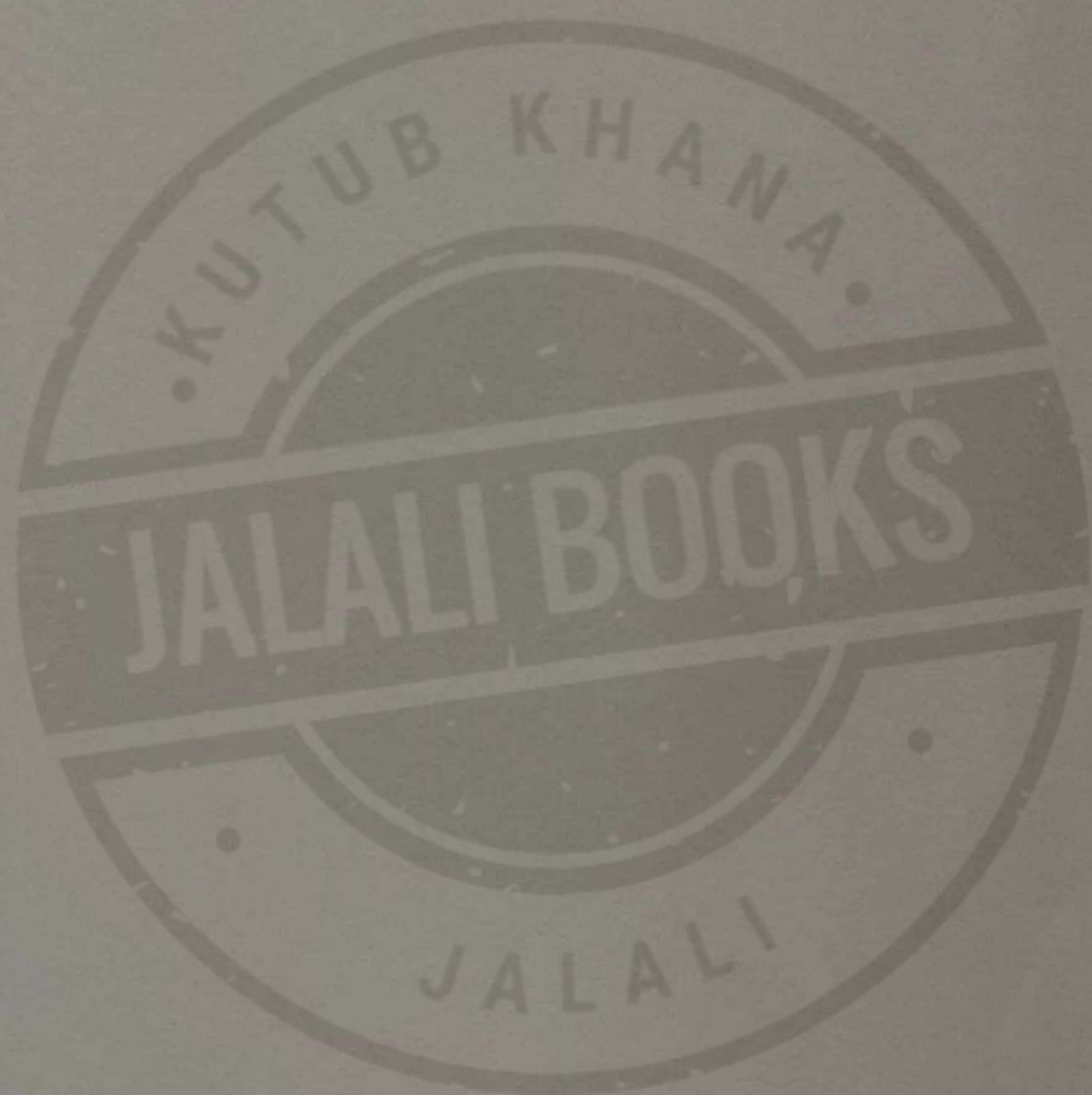
ایک نوعمر لڑکے کی روداد

مجھے سب یاد ہے

رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

923.4 Aabdi, Raza Ali
Mujay Sub Yaad He/ Raza Ali Aabdi.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2019.
120pp. : with picture.
1. Autobiography.
I. Title.

2019ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3204-X
ISBN-13: 978-969-35-3204-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

یادوں کی قطار

جو بیان بچکانا لگا، لگنے دیا

یہ کتاب اور طرح کی ہے۔ سب سے جدا، سب سے مختلف۔ یہ کتاب کاغذ پر نہیں لکھی گئی۔ اس کا متن آج کے جدید انٹرنیٹ کے راستے فیس بک پر لکھا گیا۔ یہ سب کچھ ہر دوسرے تیسرے دن ٹکڑیوں میں تحریر ہوا۔ پھر ہاتھ کے ہاتھ پڑھنے والوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ذرا دیر بعد جواب میں ان کا رد عمل آنے لگا۔ اس طرح کی تنقید کا الگ ہی لطف ہوتا ہے۔ کسی نے کچھ لکھا اور کسی نے کچھ۔ اکثر نے تعریف کی جو ایک عام بات ہے۔ لیکن بہت سے پڑھنے والوں نے حیرت، تعجب اور خوشی کا اظہار کیا۔ حیرت نئی نسل کے پڑھنے والوں کو ہوئی جن کے لئے ایک نوعمر لڑکے کے مشاہدے بالکل نرالے تھے۔ تعجب انہیں ہوئی جن کا خیال تھا کہ کمسنی کی باتیں لوگ آسانی سے بھلا دیتے ہیں۔ خوشی ان کو ہوئی جو خود بھی ایسے ہی زمانوں سے گزر کر آئے تھے اور مسرور تھے کہ ان کا زمانہ بھی کچھ جدا نہ تھا اور زندگی کے تجربے میں وہ بھی میرے ہم نوا رہے۔ لیکن جو بات میرے دل کو لگی وہ ان کی تھی جنہوں نے کہا کہ زندگی کے سادہ ورق پر پہلے پہل ابھرنے والے نئے نئے نقوش بہت عرصہ گزر جانے کے بعد بھی تازہ رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ فرق یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنا وہ زمانہ بیان نہیں

کرتے اور جنہیں لکھنے کا ہنر آتا ہے وہ لکھتے نہیں۔

میرا قصہ تو یوں ہے کہ جوں ہی عمر ستّر پچھتّر سے آگے بڑھی، میں نے محسوس کیا کہ پرانی یادیں ابھرنے میں کچھ زیادہ ہی مستعدی دکھا رہی ہیں۔ یوں لگا کہ وہ بھولے بسرے زمانے میرے کان میں کہے جا رہے ہیں کہ لکھ ڈالو، اس سے پہلے کہ دو چیزیں محو ہو جائیں: تمہاری یادیں اور خود تم۔ پھر ایک اور کمال ہوا۔ جب میں نے بھولے بسرے وقتوں کا حال لکھنا شروع کیا تو جو کچھ یاد تھا وہ تو لکھا گیا، لیکن جو کچھ اس کے ساتھ لگا لگا چلا آیا وہ کسی بونس سے کم نہ تھا۔ کبھی کبھی تو گزرے وقت مجھ پر یلغار کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں قریب قریب ہر روز اپنی لکھائی میں اضافے کرتا گیا۔ البتہ کچھ مجبوریاں میرا ہاتھ روکتی رہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا، میں لکھتا گیا اور انٹرنیٹ کے فیس بک پر اس کی تشہیر کرتا گیا۔ لیکن اس میں بات کہنے کی جگہ محدود تھی۔ یعنی مجھے زیادہ سے زیادہ چھ سو لفظوں میں بات ختم کرنی ہوتی تھی۔ لفظ زیادہ ہو جائیں تو حروف چھوٹے کرنے پڑتے تھے۔ حروف چھوٹے ہوں تو پڑھنے والوں کو دشواری اور الجھن ہوتی تھی۔ اس کا اثر برا ہوا۔ بارہا نہیں، اکثر لکھتے لکھتے آگے نکل گیا۔ اور پھر جملے کے جملے کاٹ کر تحریر کو چھ سو لفظوں میں کھپانا پڑا۔ اس عمل میں اکثر بہت دل چسپ کہانیاں تحریر سے نکالنی پڑیں۔ لیکن میں نے اسی وقت طے کر لیا کہ جب کبھی اپنے لڑکپن کے بیان کو کتاب میں ڈھالوں گا تو جگہ کی تنگی کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکوں گا۔ اپنی بات کہوں گا اور وہ بھی بڑے اور جلی حروف میں۔

تو اس سے پہلے کہ اپنی نوعمری کی کہانی کہوں، دو ایک باتیں بیان کر دوں تو اچھا ہو۔ اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ اپنے ایک ہندوستانی دوست کو بتا رہا تھا کہ میں نے چودہ پندرہ سال تک ہندی میں تعلیم پائی۔ اس پر دوست نے کہا کہ اپنا نام ہندی میں

لکھ کر دکھاؤ۔ میں نے دکھایا۔ دوست خوب ہنسا اور بولا کہ تمہارا خط بالکل بچّوں جیسا ہے۔ وہ یقیناً تھا۔ ہندی لکھنے کا عمل جس عمر میں رک گیا، تحریر کا انداز بھی وہیں ساکت ہو گیا۔ یہی قصہ یادداشت کا ہے۔ جس عمر میں جو کچھ ہوا، اب اسّی برس کی عمر میں اسے دہراتا ہوں تو سوچنے کا انداز آج بھی اسی کم سنی جیسا ہے۔ اور جب بیان کرنے کی باری آئی تو محسوس ہوا کہ لہجے میں لڑکپن صاف جھلکتا ہے۔ میں نے اپنے اس اسلوب کے ساتھ ایک سلوک کیا۔ اس کو جوں کا توں رکھا۔ اگر اپنا ہی بیان کبھی بچکانہ لگا تو لگنے دیا۔ کبھی کبھی لکھنے کے بعد خود پڑھا تو اس میں نوعمری کا بھولپن اور بعض اوقات معصومیت مجھے اچھی لگی۔ بارہا معلومات میں کمی کا احساس ہوا تو میں نے تاریخ کی کتابوں میں حقائق تلاش نہیں کئے، بات کو ویسا ہی ناپختہ رہنے دیا۔ بعض لوگوں کے نزدیک میں نے یہ برا کیا۔ لیکن ایک ضروری بات کہنے کا یہیں مقام ہے۔ یہ تحریر جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے، تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ یہ کوئی درسی کتاب بھی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تحریر آگے چل کر تاریخ لکھنے والوں کے لئے حوالہ نہ بنے۔ لیکن میں اسے ایک ایسا مرتبان تصور کرتا ہوں جس میں ایک نوعمر لڑکے نے، جسے قدرت نے ہر بچّے کی طرح مشاہدے کی صلاحیت عطا کر دی تھی، جو کچھ دیکھا، محسوس کیا، یاد رکھنے کے قابل جانا اسے محفوظ کر دیا ہے۔

جس زمانے کی یہ روداد ہے، وہ کسی کونے کھدرے میں پڑا معمولی زمانہ نہ تھا۔ جن دنوں میں نے ہوش سنبھالا، دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی، جنگ کے سائے ملکوں اور قوموں کے سروں پر منڈلا رہے تھے، دنیا کی تاریخ میں پہلی بار مہلک ترین ہتھیار چلایا جا رہا تھا۔ آزادی کا نعرہ بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نعرے میں ایک الگ وطن کی صدا شامل ہو رہی تھی۔ پھر سرزمین کو نہ صرف آزادی ملی بلکہ اس کے دو

ٹکڑے ہوئے۔ پھر غضب کا سناٹا چھایا اور اس کے بعد جو قیامت ٹوٹی اور ادھر کی آبادی اُدھر اور اُدھر کی آبادی ادھر ہونے چلی تو راہ میں موت گھات لگائے بیٹھی تھی۔ ایک کمسن لڑکے نے یہ سارے منظر دیکھے۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ عمر کے اس مرحلے میں اسے اپنا اسکول، اپنے نوعمری کے ساتھی، اپنا گھر، اپنا شہر اور اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ یہ سب شعور کے سادہ ورق پر نشان نہیں ڈال رہے تھے، کھرونچے لگا رہے تھے۔ اس تحریر میں وہی دور اور وہی زمانہ پس منظر بنا ہے۔ پیش منظر میں ایک لاابالی لڑکے کے شعور میں گھر کرنے والی کڑوی کسیلی باتیں بھی مسلسل حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔

یہ تحریر چند ایک ٹکڑوں میں بانٹ دی گئی ہے۔ فیس بک پر کبھی میرا گھرانا اس کا عنوان بنا، یہاں کچھ تحقیق سے کام لے کر میں نے اپنے خاندان کا حال دریافت کیا اور تاریخ کے ورق کھنگالے۔ کبھی میرا شہر میرا موضوع بنا، اس سے میری جذباتی وابستگی کے لطیف پہلو اجاگر ہوئے۔ کہیں میرے کھیل میں شریک لڑکے یا ہم جماعت دوست اس داستان کے کردار ٹھہرے۔ اور کہیں میرے نوعمری کے وہ چھوٹے چھوٹے سفر بیان ہوئے اور بات اس سفر تک پہنچی کہ ترک وطن کہیں جسے۔

ایک اور ضروری بات۔ یہ کہانی کیونکہ فیس بک پڑھنے والوں کی برادری کے درمیان بیٹھ کر کہی گئی، اس کا انداز بھی اسی طرح کا ہے۔ ابّا کو ابّا اور امّاں کو امّاں کہا گیا ہے، بڑی باجی، چھوٹی باجی اور ابی باجی کا ذکر کچھ یوں ہے جیسے آپس والوں کو سنایا جاتا ہے۔ رسمی القاب و آداب کے تکلف میں نہ پڑنے کی رسم ابّا نے ڈالی تھی ورنہ ان کے اور سب بھائیوں کے ناموں کے ساتھ لفظ 'نواب' لگا ہوتا۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنے گھرانے کے افراد کو جیسا میں نے پایا، آپ بھی ویسا ہی پائیں۔ ان کے بارے میں میرے احساسات جیسے ہیں، آپ کے بھی ویسے ہی

ہوں۔ کم سے کم ایک بھائی کے بارے میں یہ احساسات خوش گوار نہیں، آپ کو مکمل آزادی ہے کہ اپنی پیشانی کو جس حال میں چاہیں رکھیں۔

یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اس تحریر میں لفظ 'میں' اور 'میرے' کی تکرار بار بار ہوگی۔ جی چاہے بھی نہ ہو، ہوگی۔ مگر مجھے یقین سا ہے کہ آپ کی طبیعت پر گراں نہیں گزرے گی۔ اور یہ بتانا بھی ضروری اور بہت ضروری ہے کہ یہ ساری داستان اگرچہ یو پی کے ایک چھوٹے سے شہر روڑکی اور اس میں آباد متوسط طبقے کے ایک مہذب کنبے کے ایک نوعمر لڑکے رضا علی کی ہے لیکن سوچیں تو وہ شہر کسی بھی علاقے کا اور وہ لڑکا کسی بھی گھرانے کا ہوسکتا ہے۔ ادبی تنقید والے جس افسانے کو علامتی افسانہ کہتے ہیں، وہ تو خدا جانے ہوتا بھی ہے یا نہیں لیکن یہ افسانہ، یہ میرے زمانے کا فکشن، سچ پوچھئے تو بنا بنایا علامتی ہے۔ یہاں کہا جا سکتا ہے کہ کسی اور کے نام اور کہیں کے واقعے سے مطابقت نظر آئے تو محض اتفاق ہوگا اور سنا ہے کہ اتفاق میں برکت ہوتی ہے۔

میری جو اور جتنی داستان اس کتاب میں بیان ہوئی ہے اس کے خاتمے پر ایک بڑا اور بہت بڑا سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ پھر کیا ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ میری داستان حیات نہیں۔ یہ وہ بھی نہیں جسے عرف عام میں سوانح عمری کہا جاتا ہے۔ یہ بڑے اہتمام سے عمر کے اس علاقے تک محدود ہے جسے عنفوان شباب کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جہاں سے ماں باپ کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور پہلی بار ہماری آنکھیں کھلتی ہیں وہاں سے زندگی ایک بالکل ہی نئے ڈھب سے گزرنی شروع ہوتی ہے۔ یہاں عرض کرتا چلوں کہ میں نے زندگی کے پندرہ برس اخبار سے وابستہ رہ کر گزارے ہیں اور کوئی پینتیس سال ریڈیو کی ملازمت اختیار کر کے گزارے ہیں۔ مجھ سے ایک نیکی یہ سرزد ہوچکی ہے کہ میں نے اخباری زندگی کے ان پندرہ برسوں کا

احوال اپنی کتاب 'اخبار کی راتیں' میں لکھ دیا اور ویسی ہی ایک چھوٹی سی کتاب 'ریڈیو کے دن' کے نام سے تحریر کر دی جو بی بی سی لندن کی اردو سروس سے میری رفاقت کی روداد ہے۔

آخر میں کہوں گا کہ پڑھیے اور پڑھتے پڑھتے میرے زمانے اور میرے گھرانے کا کردار بن جائیے۔ اس کنبے میں آپ کا خیر مقدم ہے۔
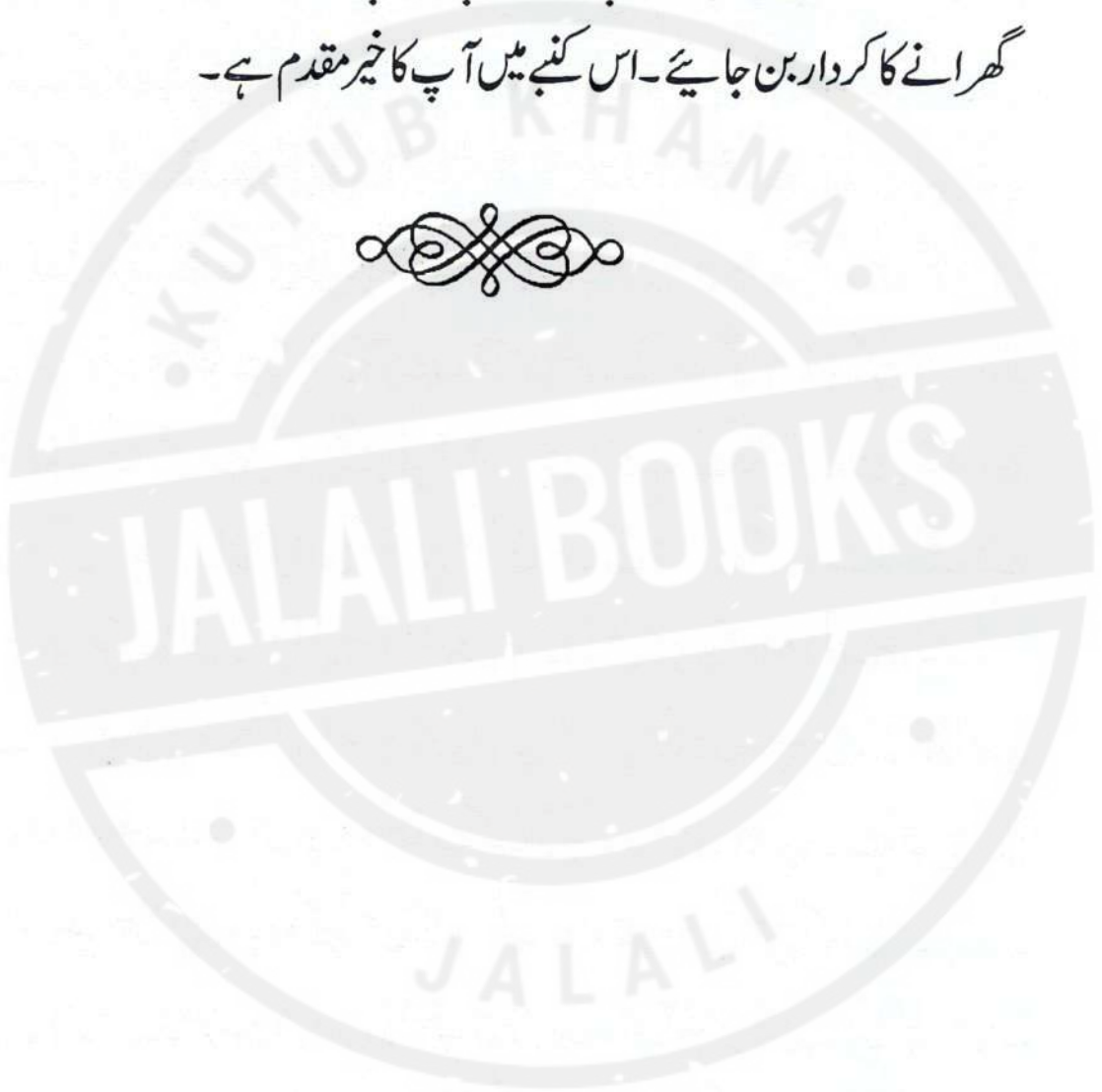
جب مدد آ گئی

میرے ابّا لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ میرے دادا پردادا شمس آباد کے نواب تھے۔ ان سب کی اودھ کے حکمرانوں سے رشتے داریاں تھیں۔ کیا شاہانہ رہن سہن رہا ہوگا، ہمیں خبر نہیں، نہ اس میں سے کچھ ہمارے حصے میں آیا۔ میری ضعیف پھوپھی کو اپنا بچپن یاد تھا۔ وہ بتایا کرتی تھیں کہ عید کے روز شاہی ہاتھی بڑے دروازے کے راستے ابّا کے پردادا سید عنایت علی خاں بہادر کے گھر میں لایا جاتا تھا اور وہ نواب صاحب کی بیگم سے سلامی وصول کرتا تھا۔ ابّا نے اپنے نام کے آگے پیچھے کوئی ایسا خطاب یا لقب نہیں لگایا جس سے ان کے بزرگوں کا بڑا پن ٹپکتا ہو۔ یہ تو ہوئی ان کے ددھیال کی بات، ان کی ننھیال کا سلسلہ جا کر میر باقر سوداگر سے ملتا ہے جو جواہرات کے تاجر تھے اور ایران سے ترک وطن کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے جواہرات اونٹوں پر لاد کر ایران سے ہندوستان لائے گئے تھے۔ میر باقر سوداگر کی دو بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک کلثوم بیگم کی شادی ہمارے شمس آباد کے نواب کرامت علی سے ہوئی۔ ان کے ہاں ایک بیٹے نواب شوکت علی پیدا ہوئے لیکن اس ولادت کے کچھ عرصے بعد ہی نواب صاحب چل بسے۔ اب ایک شرعی مسئلے نے سر اٹھایا۔ بیٹا اگر باپ سے پہلے

مرجائے تو باپ کی چھوڑی ہوئی دولت میں یتیم پوتے کا کتنا حصہ ہونا چاہئے، اس سوال پر وہ غضب کی مقدمہ بازی ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ میر باقر سوداگر اپنی بیوہ بیٹی کلثوم بیگم کو لکھنؤ لے آئے۔ لکھنؤ شہر کے قلب میں سوداگر کا امام باڑہ تعمیر ہوا اور اس کے آس پاس کا علاقہ جوہری محلّہ کہلایا۔ یہ دونوں اب بھی قائم ہیں۔ سوداگر صاحب بے حد دولت مند تھے۔ وہ بڑی بڑی زمینوں، گاؤں دیہات اور باغوں کے مالک تھے۔ کسی زمانے میں سوداگر کے باغ کے آم بہت مشہور تھے اور شہر میں اسی نام سے آواز لگا کر بیچے جاتے تھے۔ اسی علاقے میں سوداگر کی حویلی بھی تھی جو میں نے سنہ پچاس میں دیکھی تھی۔ وہ ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ ہماری بوڑھی پھوپھی نے اس میں اپنی زندگی کے شروع کے برس گزارے ہوں گے۔ وہ بتایا کرتی تھیں کہ لڑکیاں حویلی کے تہ خانے کی مٹّی کھرچ کر باہر روشنی میں لا کر اسے پانی سے دھویا کرتی تھیں تو اس میں چھوٹے چھوٹے موتی نکلتے تھے۔

۷ جولائی ۱۸۸۴ء کو نواب شوکت علی خاں کے گھر میرے ابّا پیدا ہوئے۔ اس وقت لکھنؤ پر انگریزوں کے قبضے کو تیس برس ہونے والے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دنیا کے ہر عروج کی طرح ہمارے گھرانے کی نوابی شان و شوکت پر بھی زوال شروع ہوا اور اس خاندان پر مصیبت کے بادل منڈلانے لگے۔ نواب صاحب بلا کے شوقین مزاج تھے۔ نہ صرف نواب شوکت علی بلکہ گھر کے اکثر مرد عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ انہوں نے کئی کئی بیویاں کیں اور مردانے میں کم سے کم ایک ایک داشتہ ہر ایک نے رکھ چھوڑی۔ پھوپھی بتاتی تھیں کہ جب کبھی ان کا اور بیگمات کا آمنا سامنا ہو جاتا تو بیگمات ان سے کہا کرتیں (پھوپھی کے الفاظ میں) ”اے تم تو ان کے پاؤں کی جوتی ہو، جب جی چاہا اتار پھینکی“۔ نواب صاحب کو سو طرح کے شوق تھے۔ انہوں نے اعلیٰ

سے اعلیٰ ذات کے کبوتر پال رکھے تھے جو ہر مقابلے میں بڑے بڑے انعام جیت کر آتے تھے۔ انہیں اپنی نوابی پر ناز اور اپنی ہٹ دھرمی پر فخر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالف فریق سے ان کی پتنگ کا جو پیچ پڑا، نواب صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ عمر بھر پیچ ڈالیں گے، ہار نہیں مانیں گے۔ بس پھر کیا تھا، چھت پر شامیانے لگ گئے، قناتیں کھڑی ہو گئیں، دریاں اور قالین بچھ گئے۔ شہر بھر کے مصاحبین واہ واہ کے نعرے لگانے کے لئے جمع ہو گئے۔ بڑے بڑے ماہروں کے بنائے ہوئے کنکوّے بڑھائے گئے اور کھینچنے اور ڈھیل دینے کے ایسے ایسے کرتب دکھائے جانے لگے کہ کبھی واہ واہ کا نعرہ بلند ہوتا تو کبھی جھک جھک کر آداب آداب بجا لائے جاتے۔ دوسرے فریق کی چھت پر بھی کچھ ایسا ہی منظر تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ نواب صاحب کی املاک فروخت ہونے لگیں۔ گھر کی قیمتی اشیا بازاروں میں سج گئیں۔ زمینیں گروی رکھی گئیں، باغ نیلام ہو گئے اور کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ مقابلہ چودہ سال چلا۔ آخر انگریز ریذیڈنٹ نے دیکھا کہ دو گھرانے تباہی کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں تو اس نے بیچ بچاؤ کرایا۔ بڑی مشکل سے اس شرط پر صلح ہوئی کہ ہماری پتنگ بیاہ کر دوسرے فریق کے گھر جائے گی۔ اس تابوت میں آخری کیل اس طرح ٹھونکی گئی کہ دو پتنگوں کی دھوم دھام سے شادی ہوئی جس میں رہا سہا پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ پھوپھی بتاتی تھیں کہ چھت پر بچھے بڑے بڑے قالین بوسیدہ ہو کر اتنے گل چکے تھے کہ وہ جوں ہی اٹھائے جاتے، ان کے ٹکڑے ہاتھ میں آجاتے تھے۔ اُس وقت خاندان کا ایک نوجوان اس معاشرے سے نکل بھاگنے کی راہ دیکھ رہا تھا۔ وہ تھے میرے ابّا، میر اکبر علی عرف پیارے صاحب۔

یہ داستان ابھی جاری ہے۔

میرے ابّا

جب ابّا نے دیکھا کہ خاندان کس بے دردی سے بزرگوں کی دولت لٹا رہا ہے اور اس میں ایک دمڑی کا بھی اضافہ نہیں ہو رہا۔ اہلِ لکھنؤ چو ہے نامہ اور بلّی نامہ پڑھ پڑھ کر سر دھن رہے ہیں اور مثنوئ زہرِ عشق گھر کی عورتوں سے چھپ چھپ کر پڑھ رہے ہیں تو ابّا نے اپنا مختصر مال اسباب سمیٹا اور جوہری محلّہ کو خیر باد کہہ دیا۔ انہوں نے لکھنؤ کے Hewitt انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح پندرہ برس کے ایک لڑکے نے نوابی کا چولا اتار پھینکا۔ ابّا کے پرانے کاغذوں میں ان کے لکھے ہوئے ایک مضمون کا تراشا ملا جو لکھنؤ کے ایک اخبار میں سنہ ۱۹۱۹ میں چھپا تھا۔ (اب پتہ چلا، اخبار میں لکھنے کی روایت کہاں سے چلی)۔ مضمون کا عنوان تھا: میں نے لکھنؤ کیوں چھوڑا۔ انہوں نے لکھا کہ بدقسمتی سے میرے خاندان کا شمار شہر کے نواب زادوں میں ہوتا ہے۔ اس طرح کے خطاب پر لوگ ناز کرتے ہیں۔ مگر میں نے طے کیا ہے کہ جیسے بھی بنے گا، اپنے ہاتھ سے اپنی روزی کماؤں گا چاہے اس کے لئے مجھے مزدوری کرنا پڑے۔ اگر چہ اس میں میرے نوابی لباس پر داغ دھبّے لگیں گے مگر میں جانتا ہوں کہ آنے والے زمانوں میں یہی داغ دھبّے روشن چراغ بن کر چمکیں گے۔

آگے چل کر ابّا نے لکھا کہ اپنی ابتدائی تربیت کے بعد جب میں نے انسٹی ٹیوٹ کے استادوں کو بتایا کہ میں روڑکی جا کر انجینئرنگ کالج میں داخلہ لینا چاہتا ہوں تو وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے اور بولے: کیوں، خاندان کی کمائی ختم ہو گئی ہے کیا؟ اگر تم قلی کا کام کرنا چاہتے ہو تو اپنا نام نواب قلی خان رکھ لو۔ لوہے کو پانی کی طرح

پگھلانا تمہارے بس کا کام نہیں۔ میں ان لوگوں کی اس بات کے جواب میں اتنا ہی کہہ سکا کہ اپنی روزی اپنے ہاتھوں کماؤں گا۔ اور جب گھر والوں کو علم ہوا کہ میں انجینئر بننا چاہتا ہوں تو وہ آگ بگولا ہو گئے اور بولے کہ ہاں ہاں، لوہار یا بڑھئی بن جاؤ۔ ایک تھیلے میں رندا بسولا ڈال کر گلی گلی آواز لگانا: ٹوٹی پھوٹی چار پائیاں مرمّت کرالو۔ جاؤ اپنے آبا و اجداد کے نام کو بٹّہ لگاؤ۔ میں نے دل میں کہا کہ خدا کرے اپنی محنت سے کماؤں اور باپ دادا کے چھوڑے ہوئے ٹکڑوں پر نہ پلوں۔

لکھنؤ میں تربیت مکمل کر کے سید اکبر علی نے روڑکی جانے کی ٹھان لی۔ یہ بات ۱۹۰۱ء کی ہے۔ انہیں ٹامسن انجینئرنگ کالج میں مشینوں کی نقشہ سازی کی جماعت میں داخلہ مل گیا۔ ان کے پرانے کاغذوں میں وہ سند نامہ بھی نکلا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جماعت میں اوّل آئے تھے۔ انہوں نے کالج ہی میں استاد کے منصب کے لئے درخواست دی جو قبول ہو گئی اور ابّا وہاں مکینیکل ڈرائنگ کے استاد مقرر ہو گئے۔ اُس دن ایک ابّا ہی کے نہیں، ہم سب کے مقدّر بدل گئے۔ اگست ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ میں ان کی شادی شاہی خاندان کی سلطان حشمت آرا بیگم سے طے ہو گئی جو سمرقند کے تیموری خاندان کے جلال الدین مرزا محمد مسعود قدر گورکانی کی بیٹی تھیں۔ وہ بیاہ کر روڑکی آ گئیں مگر جلد ہی انتقال کر گئیں۔ ان سے دو بچّے ہوئے، حسن علی عابدی، جنہیں ہم سب بھائی جان کہتے تھے اور باقری بیگم، جو ہماری ابی باجی کہلائیں، وہی تھیں جنہوں نے خاص طور پر میری کردار سازی کی۔ پستی سے اٹھا کر مجھے بھی اونچا کیا اور میرا سر بھی۔ خوش نصیب ہوں کہ انہوں نے جیتے جی میرا عروج بھی دیکھا۔ دکھ یہ ہے کہ میری امّاں جو میری طرف سے بہت فکرمند نظر آتی تھیں، میری خوش حالی نہ دیکھ پائیں۔ مگر دل کو یقین سا ہے اب دیکھ رہی ہوں گی۔ آگے ان ہی کا ذکر آ رہا ہے۔

میری امّاں

اب ابّا اکیلے تھے۔ گھر میں چھوٹا بیٹا تھا اور اس سے بھی چھوٹی ایک بیٹی تھی۔ اس پر ابّا نے دوسری شادی کر لی۔ اس بار گھر میں کانپور کے بہت بڑے اور مشہور حکیم محمد یوسف کی بیٹی محمودہ بیگم بیاہ کر آئیں۔ ان کی والدہ (ہماری نانی اماں) لکھنؤ کی حمیدہ بیگم تھیں جو حکیم صاحب کی چوتھی بیوی تھیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ چار بیویاں لانے میں حکیم صاحب کی دواؤں کا بھی کمال تھا۔ وہ جعفری سید تھے اور ان کا شجرہ کرمان، ایران کے بڑے بزرگ شاہ نعمت اللہ ولی سے ملتا تھا۔ شاہ صاحب سے ایک دنیا واقف ہے۔ ان کے روضے پر آج بھی زائرین کا بڑا مجمع رہتا ہے۔ ان سے چودہ ہزار اشعار کی وہ طویل نظم منسوب ہے جس میں آنے والے زمانوں کی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ نانی اماں کا ایک بار روڑکی آنا مجھے یاد ہے۔ شاندار بڑھاپا تھا۔ بہت روشن خیال خاتون تھیں، تعلیم یافتہ تھیں اور انگریزی زبان کی شد بد تھی۔ وہ سید نواب حسین کی بیٹی تھیں جو موسوی سید تھے اور جن کا سلسلہ وزیروں اور سپہ سالاروں سے ملتا تھا۔ ان کے گھرانے سے بیاہ کر جب ہماری اماں روڑکی آئیں تو سنا ہے کہ ان کی عمر بہت کم تھی اور نہایت خوب صورت تھیں۔ روڑکی آتے ہی ذمہ داریوں نے ان پر یلغار کر دی اور پھر یہ ہوا کہ انھوں نے نہ صرف یہ دو بچّے بلکہ خود اپنی دو بیٹیاں اور چھ بیٹے کچھ یوں پالے جیسے کوئی پرندہ اپنے چوزوں کو اپنے پروں میں لے لیتا ہے۔

بھائی جان، حسن علی عابدی اگرچہ ان کا سوتیلے بیٹے تھے لیکن ان کی انجینئرنگ کی مہنگی تعلیم کا خرچ اٹھانے کے لئے امّاں نے جہیز میں ملنے والا اپنا مکان بیچ دیا۔ یہ بہت کڑا وقت تھا۔ سنہ تیس کے عشرے میں ساری ہی دنیا کے حالات

بگڑے۔ کساد بازاری کی زد میں آ کر سید اکبر علی، ہمارے ابّا کو وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا۔ اب ان کے ہاتھ میں صرف پچپن روپے ماہانہ پنشن رہ گئی۔ ان کے سامنے گھر میں سات افراد کو روزی روٹی فراہم کرنے کا کٹھن مرحلہ تھا۔ اس دوران وہ لمحہ آیا جب ہر باپ کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ حسن علی، بھائی جان سول انجینئر ہو گئے اور انہیں یو پی کی حکومت میں بڑی ساکھ والے گزیٹڈ افسر کا منصب عطا ہوا۔ ابّا نے اپنے قلیل وسائل میں خدا جانے کیسے ایک بالکل نئی فورڈ کار انعام میں دی۔ ابّا کو کیسا سکون ملا ہوگا کہ اب بڑا بیٹا گھر بھر کی زندگی سنوارے گا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ سب تدبیریں الٹی ہو گئیں۔ ابّا کے دل کو پہلا دھچکا لگا۔ سرکاری ملازمت ملتے ہی بھائی جان نے ہم لوگوں کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ ابّا جس دشوار مقام پر کھڑے تھے، وہیں کھڑے رہ گئے۔ ان کے سامنے اب اگلے بیٹے اصغر علی کی تعلیم کا مرحلہ اور مسئلہ تھا۔ ابّا نے بھائی جان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے جو جواب دیا اس نے ابّا کو بڑا دکھ دیا۔ انہوں نے کہا کہ اصغر علی کو کام پر لگائیے اور اپنا بوجھ کم کیجئے۔ ان کا جواب سن کر ابّا نے ایک فیصلہ کیا، ایک بڑا فیصلہ۔ انہوں نے ایک اعلان کیا۔ وہ یہ کہ وہ اگلے بیٹے کو نہ صرف تعلیم دلائیں گے بلکہ حسن علی سے بہتر تعلیم۔

وہ جو کسی نے کہا کہ آپ اگر ایک بار ٹھان لیں تو پوری کائنات آپ کا ہاتھ بٹانے لگتی ہے۔ یہ داستان یہاں ختم نہیں ہوتی، ایک بڑی داستان یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

جنگ کا آغاز

دینا کے مالی حالات بگڑنے لگے۔ ابّا کو وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا۔ بھرے پُرے گھر کو پالنا آسان نہ تھا۔ آخر انہوں نے کاروبار کرنے کا فیصلہ کی۔ ابّا

نے اپنی آدھی پنشن گروی رکھ کر سرمایہ اکٹھا کیا اور مجھے اُس بڑی سی دکان کی تصویر یاد ہے جس پر 'انگلش بوٹ ہاؤس' کا بورڈ لگا تھا۔ انہوں نے جوتوں، چمڑے کی مصنوعات اور کھیلوں کے سامان کا کاروبار شروع کی۔ بزنس نہیں چلا۔ گھاٹے کا سودا ثابت ہوا اور وہ دکان کوڑیوں کے بھاؤ بیچنی پڑی۔ مگر اُس وقت قدرت ہمارے گھرانے کے سروں پر ایک نیا آفتاب چمکانے کو تھی۔ جدید ٹیکنولوجی یعنی گراموفون اور موسیقی کے ریکارڈ نے رواج پکڑا۔ سیاہ رنگت کے دس انچ کے ریکارڈ کو لوگ توا کہتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ اس میں سے گانے بجانے کی آوازیں کیسے نکلتی ہیں۔ اُس وقت ہز ماسٹرز وائس کا گراموفون پورے ایک سو روپئے میں آتا تھا جس کا ڈھکن اٹھاؤ تو سامنے اس کتّے کی تصویر نظر آتی تھی جو گراموفون کے سامنے بیٹھا اپنے آقا کی آواز سن رہا ہے۔ ابّا کو پتہ چلا کہ جاپان والوں نے گراموفون بنا کر کلکتے کے بازاروں میں پہنچا دیئے ہیں اور وہی باجا جو ایک سو روپئے میں آتا تھا، ویسے ہی جاپانی باجے کی قیمت صرف دس روپئے رکھی گئی ہے۔ ابّا اپنی جمع پونجی لے کر کلکتہ جا پہنچے۔ یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ وہاں کے بازاروں میں جاپانی مال کی بھرمار تھی۔ ابّا نہ صرف گراموفون اور ریکارڈو کا بڑا اسٹاک بلکہ فلپس کا وہ بڑا سا ریڈیو بھی لے آئے جس کے بارے میں عام لوگوں کو یقین تھا کہ اس کے اندر چھوٹے انسان چھپے بیٹھے ہیں۔ اسی دوران دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ میں نے گودوں سے اتر کر جو پہلا منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ ابّا کے 'ریڈیو اینڈ گراموفون ہاؤس' کا کاروبار زوروں پر تھا۔ ہمارا گھرانا روڑکی کے محلّہ سوت کے پرانے بوسیدہ مکان سے نکل کر بالکل نئے مکان میں منتقل ہو چکا تھا۔ اوپر کی منزل میں ہم سب رہتے تھے، نیچے کی منزل میں دکان اور کچھ اور رہائشی گنجائش تھی۔ گھر میں گراموفون کے گانے گونجنے لگے ہوں گے جس کا قصہ میری باجیاں سناتی

تھیں۔ ہمارے گھر میں ایک لڑکا کام کرتا تھا جس کا نام یعقوب تھا۔ وہ روز صبح مجھے اپنے کندھوں پر بٹھا کر ہوا خوری کے لئے لے جاتا تھا۔ ان ہی دنوں کوئی گانا مقبول ہوا جس کے بول تھے: دل آ گیا تم پہ دل ہی تو ہے۔ باجیاں بتاتی ہیں کہ میں یعقوب کے کندھوں پر سوار لہک لہک کر گایا کرتا تھا: یعقوب آ گیا تم پہ، دل ہی تو ہے۔

عین اُن ہی دنوں ایک سانحہ ہوا۔ ابّا پر ڈبل نمونیا کا حملہ ہوا۔ اس وقت نمونیا کی کوئی موثر دوا نہ تھی۔ ان کی حالت تیزی سے بگڑنے لگی۔ گھر میں عجب سراسیمگی کا عالم تھا۔ عام دوائیں اثر نہیں کر رہی تھیں۔ اچانک سب کا خیال ابّا کے کالج کے زمانے کے دوست ڈاکٹر پریرا کی طرف گیا۔ انہیں اطلاع کی گئی تو وہ دوڑے ہوئے آئے اور فوراً ہی سمجھ گئے کہ مریض کی حالت اچھی نہیں۔ وہ میرے بڑے بھائی کو ساتھ لے کر اپنے شفا خانے گئے اور انہوں نے ایک بڑا کام کیا۔ وہ جانتے تھے کہ نمونیا کی نئی دوا بن گئی ہے جو صرف فوج کے پاس موجود ہے۔ ڈاکٹر پریرا چونکہ بہت عرصے تک فوج کی خدمات انجام دے چکے تھے، اپنے مراسم کو کام میں لا کر انہوں نے نئی دوا حاصل کر لی۔ کچھ گولیاں دیں جو ہر چھ گھنٹے بعد دینی ہوتی تھیں اور ایسی ٹکیاں دیں جو پانی میں ڈالنے سے آکسیجن بناتی تھیں۔ اس آکسیجن کی نالی مریض کی ناک تک پہنچائی گئی اور وہ مرہم جو ان ہی دنوں ایجاد ہوا تھا اس کا سینے اور پیٹھ پر لیپ کیا گیا۔ علاج کے ساتویں دن ڈاکٹر پریرا نے اعلان کیا کہ آج کی رات بڑی اہم ہے۔ اگر اکبر علی نے یہ رات خیریت سے گزار لی تو ان کی جان بچ جائے گی۔ وہ رات امّاں اور بیٹیوں نے فریادی نوحہ پڑھتے ہوئے گزاری: اے کُل کے مددگار، مدد کرنے کو آؤ۔

اور جس وقت نئی صبح کا سورج نمودار ہوا، مدد آ چکی تھی۔

ابّا کی نیکیوں کا صلہ

ہم سنتے آئے تھے کہ دایاں ہاتھ نیکی کرے تو یوں کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ یہ ایک ایسی ہی نیکی کی روداد ہے۔ پہلے اپنی کمسنی کا وہ منظر بیان کردوں جب روڑکی کے شاندار انجینئرنگ کالج میں داخلے کے امتحان ہوتے تھے۔ پورے ہندوستان کے کونے کونے سے لڑکے وہ امتحان دینے روڑکی آجاتے تھے۔ شہر میں ان دنوں ایک بھی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس قسم کھانے کو بھی نہ تھا۔ لڑکے خدا جانے کہاں سے بستر وغیرہ کا بندوبست کرکے سڑک کے کنارے رہ پڑتے تھے اور راتوں کو لیمپ جلا کر یا کھمبے کی روشنی میں امتحان کی تیاری کرتے تھے۔ ہر سال کم سے کم ڈیڑھ دو سو لڑکے آتے تھے لیکن ایک عجیب بات تھی، ان میں مسلمان ایک بھی نہ ہوتا تھا۔ کبھی کوئی بھولا بسرا روڑکی آجاتا تو وہ میر صاحب کے پاس حاضری ضرور دیتا تھا۔ یوں بھی انجینئرنگ کالج میں پڑھ کر شہرت پانے والے مسلمانوں کے صرف چند ایک نام سننے میں آتے ہیں۔ مشہور ناول امراؤ جان ادا کے مصنف اور علامہ اقبال کے بڑے بھائی نے وہاں تعلیم پائی۔ ان ہی دنوں مرزا محمد ہادی رسوا اپنی کتابوں اور رسالوں میں باقاعدگی سے لکھ رہے تھے کہ مسلمان لڑکوں کو چاہیئے کہ ڈگری نہ سہی، کسی ڈپلومے ہی کے لئے

روڑکی جائیں۔ ہم سب کو اردو سکھانے کے ساتھ ہمارے کردار سنبھالنے والے مولوی اسماعیل میرٹھی نے بھی انجینئرنگ پڑھی تھی۔ وہی دن تھے جب میرے والد نے لکھنؤ کی نوابی شان و شوکت کو خیر باد کہا اور صدی کے پہلے برس روڑکی جا کر نہ صرف انجینئرنگ کالج میں تعلیم پائی بلکہ جماعت میں اوّل آنے کے بعد اسی کالج میں پڑھانے لگے۔ میں تصور کر سکتا ہوں کہ ابّا جب دیکھتے ہوں گے کہ وہاں پڑھنے کے لئے مسلمان لڑکے اکّا دکّا ہی آتے ہیں تو انہوں نے کچھ کرنے کی ٹھانی اور اگرچہ ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے، انہوں نے مسلمان لڑکوں کو انجینئرنگ کی تعلیم دلانے کی تحریک شروع کی۔ ابّا نے شہر میں حسینیہ ایجوکیشن فنڈ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں برادری کے سرکردہ افراد کو شامل کیا اور ملک کے سات ذہین اور ہونہار طالب علموں کو روڑکی بلا کر داخلے کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ یہ سارے کے سارے غریب گھرانوں کے لڑکے تھے۔ ابّا نے اپنے محلّہ سوت کے پرانے مکان کی بیٹھک میں ان سب کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا۔ اس گھر میں نہ پانی تھا اور نہ بجلی تھی۔ (میں اسی گھر میں پیدا ہوا تھا)۔ وہاں لڑکوں کی نہ صرف رہائش بلکہ کھانے پینے کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا۔ میری بہنیں بتاتی تھیں کہ سات جوان لڑکوں کے کھانے پکاتے ہوئے اور خاص طور پر سیروں آٹا گوندھتے ہوئے ان کے ہاتھ شَل ہو جاتے تھے۔ لڑکوں کا کھانا بیٹھک میں جاتا تھا جہاں سے اَور اَور کی صدائیں آیا کرتی تھیں۔ ان میں سے جو طالب علم ہمارے زمانے تک نظروں میں آتے رہے ان میں منظور صاحب، طاہر صاحب اور مشہور مصور عسکری صاحب شامل تھے۔ کراچی آ کر طاہر صاحب سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ بتایا کرتے تھے کہ ہمارے گھرانے نے ان کا کتنا خیال رکھا۔ عسکری صاحب نے پاکستان آ کر بہت شہرت پائی

۔وہ اچھے مصور تھے اور پورٹریٹ بنانے کے ماہر تھے۔لکھنؤ میں مشہور عمارت 'ادبستان' کا شاندار نقشہ انہوں ہی نے تیار کیا تھا اور قائداعظم کی ایک مشہور شبیہ بنائی تھی۔باقی چار جوانوں کا احوال معلوم نہیں۔ابّا کے سامان سے حسینیہ ایجوکیشن فنڈ کی مجلس عاملہ اور طالب علموں کا سنہ ۱۹۳۰ء کا ایک فوٹو نکلا جس میں یہ سب لوگ نظر آ رہے ہیں۔ابّا کو اس زمانے میں پچپن روپئے پنشن ملتی تھی۔سنا ہے وہ کئی بار بمبئی گئے اور خوجہ برادری کے صاحب حیثیت تاجروں سے عطیات لائے۔ہمیں نہیں معلوم پھر کیا ہوا۔ابّا کو کبھی اس پر ناز کرتے نہیں دیکھا۔

میرے بھائی

بڑے بھائی جان نے تو ابّا کو اپنی رائے دے دی کہ چھوٹے بھائیوں کو کام پر لگایئے۔خود بھائی جان اعلیٰ سرکاری افسر بن چکے تھے۔اس پر ابّا کے اندر کا سید زادہ جاگ اٹھا اور وہ اصول کی جنگ لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔انہوں نے اپنی بات ثابت کر دکھائی کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹوں کو بھائی جان سے بہتر تعلیم دلا کر رہیں گے۔اس دوران انہوں نے تینوں بیٹیوں کو اتنی تعلیم دلائی کہ ایک بیٹی لڑکیوں کے اسکول میں پڑھانے لگی، دوسری محرم کے دوران میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثئے پڑھنے لگی اور سب سے بڑی، یعنی ابی باجی نے نہ صرف میری بلکہ اس سے بڑھ کر میرے کردار کی تعلیم کی اور مولوی اسماعیل میرٹھی کی بے مثال کتابیں پڑھا کر مجھے یوں کہہ لیجئے کہ 'ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا'۔

جن دنوں میں نے ہوش سنبھالا، امّاں کے سب سے بڑے بیٹے اصغر علی کو ابّا اعلیٰ اور بہتر تعلیم دلانے کے لئے لکھنؤ اور کانپور بھیج چکے تھے۔میں بھائی بھائی کا ذکر

سنا کرتا تھا مگر انہیں دیکھا نہیں تھا۔ ایک بار وہ کہیں سائیکل سے گرے اور ان کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کی ایکسرے کی فلم گھر پر آئی، وہ دیکھی تو مکمل بھائی کو دیکھنے کا اشتیاق بڑھا۔ کچھ عرصے بعد وہ روڑکی آئے۔ مجھے یاد ہے مجھے دل ہی دل میں وہ کتنے اچھے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے بھائی میرے دوسرے بھائیوں کو حساب پڑھایا کرتے تھے اور کسر کے سوال سمجھاتے ہوئے وہ دو بٹا چار یا نو بٹا تین کی بجائے 'دو بٹے چار میں' یا 'نو بٹے تین میں' کہا کرتے تھے۔ بعد میں احساس ہوا، کسر سمجھانے کا یہ سب سے اچھا ڈھنگ تھا۔

ابّا کے خواب سچ ہونے لگے۔ بھائی اصغر علی نے تعلیم کے مرحلے کامیابی سے طے کیے۔ ان ہی دنوں مسلم یونی ورسٹی میں انجینئرنگ کا شعبہ کھلا۔ پاکستان کے نام ور مصور گل جی کے والد اس شعبے کے سربراہ تھے۔ سر سید احمد خاں کی پرانی خواہش تھی کہ علی گڑھ میں لڑکوں کو انجینئرنگ پڑھائی جائے۔ انہوں نے روڑکی کے ٹامسن انجینئرنگ کالج کے پرنسپل کو خط لکھا تھا کہ اپنا نصاب ہمیں دے دیجئے۔ میرا خیال ہے کہ ابّا اپنے کم سے کم ایک بیٹے کو علی گڑھ بھیجنا چاہتے تھے۔ بھائی کا وہاں جانا کہیں ستاروں میں طے تھا۔ دو برس بعد ہی انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جانے کا وظیفہ مل گیا۔ وہاں انہوں نے ایک برس اوہایو میں لگایا اور دوسرا سال اس سے بھی بڑی یونی ورسٹی ہارورڈ میں گزارا۔ اسی دوران ہندوستان کا بٹوارا ہو گیا اور دنیا کے نقشے پر نیا ملک پاکستان ابھرا۔ بھائی سے پوچھا گیا کہ تعلیم مکمل کر کے وہ کس ملک میں جانا چاہیں گے۔ انہوں نے ابّا کے مشورے سے اپنے لئے پاکستان کو چنا۔ بھائی اصغر علی نے پاکستان پہنچ کر اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پہلے حیدر آباد کے قریب کوٹری بیراج کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا۔ اس کے بعد شمال میں تربیلہ ڈیم کی بنیاد رکھی۔ اس پہاڑ جیسے ڈیم کا نقشہ

غیر ملکی ماہروں سے تیار کرایا جارہا تھا۔ بھائی نے رات دن ایک کر کے اپنا نقشہ تیار کر کے پیش کر دیا۔ اس دوران غیر ملکی نقشہ منظور ہو چکا تھا۔ پھر بھی بھائی کے ہاتھوں ڈیم کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے میر پور میں منگلا ڈیم کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا اور وہ مکمل ہوا ہی تھا کہ اقوام متحدہ نے دنیا کے مختلف علاقوں میں اپنے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے بھائی کی خدمات مانگ لیں۔ اس طرح انہوں نے انجینئرنگ کے میدان میں اپنا اور ابّا کا نام روشن کیا۔ ان کا بڑا بیٹا یعنی ابا کا پوتا اسد علی پاکستان کا سرکردہ سائنس داں ہے اور دنیا میں اس کی قدر ہے۔

ان سے چھوٹے بھائی مصطفیٰ علی کو اتفاقات نے ریڈیو انجینئر بنا دیا۔ ہوتا یہ تھا کہ شہر میں ریڈیو کی ہماری ایک ہی دکان تھی، علاقے میں جو ریڈیو بھی خراب ہوتا، مرمت کے لئے ابّا ہی کے پاس آتا۔ جب بہت سے بگڑے ہوئے ریڈیو جمع ہو جاتے تو دلّی سے ایک انجینئر کو بلایا جاتا جو آٹھ دس دن لگا کر تمام ریڈیو مرمت کر دیتا تھا۔ مصطفیٰ بھائی نے اس کے ساتھ لگ کر کافی کام سیکھ لیا اور دلّی سے کتابیں منگا کر اپنی تربیت خود کی۔ انہوں نے جلد ہی اور حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی اور پھر کبھی کسی انجینئر کو بلانے کی ضرورت نہیں رہی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایمپلی فائر بنائے جو پورے علاقے کی شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں گانے بجانے کے لئے کرائے پر چلنے لگے۔ اُس وقت تک ٹیلی وژن نہیں آیا تھا۔ آگے چل کر مصطفیٰ بھائی اس میں بھی مہارت حاصل کریں گے۔

یہاں ہمارا ترک وطن کا مرحلہ قریب آ گیا۔ مصطفیٰ بھائی لکھنؤ سے دلہن بیاہ لائے۔ یہ ہمارے گھر کی دوسری شادی تھی۔ ان سے پہلے بڑی باجی بیاہ کر دلّی چلی گئیں اور پرانے شہر کے ایک کوچے کو آباد کیا۔ مصطفیٰ بھائی سے چھوٹے سرور علی کانپور

میں تعلیم پا رہے تھے۔ یہ سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے، اس خیال سے انہیں وہیں چھوڑ دیا گیا۔ بعد میں وہ بھی پاکستان چلے آئے اور کراچی یونی ورسٹی میں اپنی سائنس کی تعلیم نہ صرف جاری رکھی بلکہ آخری امتحان میں اوّل پوزیشن لے کر کامیاب ہوئے۔ حکومت نے انہیں طباعت کی تعلیم کے لئے وظیفہ دے کر لندن بھیجا جہاں وہ لندن اسکول آف پرنٹنگ سے سند لے کر واپس کراچی آئے اور بہت بڑے گورنمنٹ پرنٹنگ پریس کے اہم منصب پر فائز ہوئے۔

ان سے ڈھائی سال چھوٹے اور مجھ سے ڈھائی سال بڑے مرتضیٰ علی شروع ہی سے سائنس کے ذہین طالب علم رہے تھے۔ روڑکی سے میٹرک کرنے کے بعد آگے کی پڑھائی کے لئے انہیں لکھنؤ اور کان پور بھیجا گیا۔ اسی دوران پاکستان وجود میں آیا اور ہم سے پہلے وہ پاکستان چلے گئے۔ انہوں نے لاہور میں تعلیم مکمل کی اور پھر وہیں پڑھانے لگے۔ سائنس سے ان کی گہری وابستگی کی وجہ سے انہیں ملک کے اسلحہ ساز ادارے میں ملازمت مل گئی۔ وہاں ترقی کرتے ہوئے وہ سرکار کی جانب سے جرمنی چلے گئے اور جدید میزائل بنانے کی تربیت لے کر واپس آئے۔ انہوں نے پاکستان کی فوج کو وہ جرمن میزائل دیا جو کوبرا کے نام سے مشہور تھا۔ یہ میزائل سنہ ۶۵ء کی جنگ میں پہلی بار چلایا گیا تو مخالف فوج نے اپنے ٹینک پیچھے ہٹا لئے تھے۔ بھائی مرتضیٰ علی کامیاب زندگی گزار کر آسٹریلیا چلے گئے اور وہیں آسودہء خاک ہیں۔

یہاں تک چونکہ انجینئروں کی بات چل رہی ہے اس لئے میں خود کو درمیان سے نکال کر اپنی بات آخر کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ مجھ سے چھوٹا بھی ایک بھائی ہے جس کے بارے میں سنا جاتا ہے کہ مجھے اس دنیا میں لانے کے بعد ابّا مطمئن ہو کر بیٹھ رہے جس پر ان کے دوستوں نے مذاق اڑایا کہ بس میر صاحب؟ ابّا نے یہ چیلنج قبول کر

لیا اور میرے چھ سال بعد اقبال عرف مہدی علی عابدی کو اس دنیا میں وارد کر دیا۔ اقبال بہت چھوٹے تھے کہ ہمارا گھرانا پاکستان منتقل ہوا۔ مگر ان میں وہ سائنس اور انجینئر نگ کے سارے جراثیم موجود تھے۔ اقبال کو کراچی آ کر بہتر اسکول میں داخلہ مل گیا اور بالآخر وہ نوعمری ہی میں برطانیہ چلے گئے اور بہت محنت مشقت کے بعد آر کیٹکچر یا فن تعمیرات کی تعلیم مکمل کی اور کامیاب آر کیٹکٹ بنے۔

اب رہ گیا میں۔ جس دن سے پڑھنا سیکھا، اخبار پڑھنے لگا اور جس روز لکھنے کا ہنر آیا، لکھنے لگا۔ روڑ کی میں ایک چھوٹی سی پرنٹنگ شاپ تھی جس کی ونڈو میں چھپائی کی مشین لگی تھی جسے ایک شخص ایک ٹانگ سے چلاتا اور دونوں ہاتھوں سے ایک ایک کاغذ چھاپتا جاتا۔ میں ونڈو کے باہر کھڑا گھنٹوں وہ بالکل ایک جیسی کارروائی دیکھتا رہتا۔ جی چاہتا تھا اپنے گھر میں ایک اپنا چھاپہ خانہ بنالوں۔ وہ کبھی نہ بن سکا۔ اس دوران اردو اخباروں میں اُن رسالوں کے اشتہار ڈھونڈتا رہتا جن میں لکھا ہوتا تھا 'نمونہ مفت'۔ میں نے درجنوں اچھے برے رسالوں کے نمونے منگا منگا کر اچھا خاصا ریڈنگ روم کھول لیا جس کا واحد قاری خود میں ہی تھا۔ خواجہ حسن نظامی کا رسالہ منادی مجھے بہت پسند تھا۔ ان کی نثر بہت دلکش ہوتی تھی جس میں گفتگو کا انداز بھلا لگتا تھا۔ پھر میں نے بچّوں کے رسالوں کو اپنی تحریریں بھیجنی شروع کیں اور سنہ پچاس میں دلّی کے ماہنامہ کھلونا میں میرا بھیجا ہوا ایک لطیفہ چھپا جو میں نے شفیق الرحمان کی کتاب 'حماقتیں' سے نقل کر کے بھیجا تھا۔

سو باتوں کی ایک بات۔ میرے اندر سائنس اور انجینئر نگ کے جراثیم قسم کھانے کو بھی نہ تھے۔ میں نے جوں ہی علم طبیعات اور کیمیا پڑھنے کی کوشش کی اسی لمحہ ہمت ہار دی اور رہ گئی انجینئر نگ کی خاندانی روایت تو اس کا حال یہ ہے کہ آج تک پتہ

نہیں کے پیچ کسنے یا ڈھیلا کرنے کے لئے اسے کس طرف گھمانا چاہئے۔ دونوں طرف گھماتا ہوں، جس جانب کام بن جائے، اسی طرف نعرہء یاہو بلند کر کے اپنی کامرانی کا جشن مناتا ہوں۔

سنہ ۵۳ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلے کا مرحلہ تھا۔ اس وقت میرے بڑے بھائیوں کی مجلس مشاورت بیٹھی جس نے طے کیا کہ مجھ پر صحافت کا جو بھوت سوار ہے اس کو شرف قبولیت بخشا جائے اور میں کالج میں ایسے مضامین لوں جو آگے چل کر میرے کام آئیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ میں معاشیات اور سیاسیات پڑھوں جس پر میں نے پوچھا تھا کہ یہ معاشیات کیا ہوتا ہے؟ میں نے کراچی کے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ یہ بڑا کمال کا کالج تھا۔ روز صبح اس کے پہلے دو پیریڈ کام کے ہوتے تھے۔ میں دیکھتا تھا کہ سینکڑوں لڑکے سائیکلوں پر آتے ہیں اور پہلے دو پیریڈ میں شریک ہو کر اور اپنی حاضری لگا کر ان ہی سائیکلوں پر بیٹھ کر اپنے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں۔ پھر پتہ چلا وہ سارے کے سارے کلرک تھے۔ بی اے کرنے کے لئے کالج نے انہیں یہ سہولت دی تھی۔ انہیں دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے سامنے بھی یہی راہ ہے مگر صاف نظر آتا تھا کہ اس راہ میں اتنا اندھیرا ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ وہ چراغ بھی دکھائی نہیں دیتا جو مجھے مستقبل کی روشن راہ دکھانے کے لئے میرا منتظر تھا۔ میں نے معمولی ملازمتیں کرنے کی جتنی بھی کوششیں کیں، ساری کی ساری ناکام ہوئیں۔ ناکام ہوئیں یا مقدر نام کی کوئی شے ہوتی ہے جس نے میری راہ نکالنے کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی اور وہ بھی مجھے بتائے بغیر۔ بس ایک دکھ ہے کہ جب میرے نصیب جاگے، ابّا اور امّاں، دونوں سو چکے تھے۔

میری باجیاں

ہمارے گھرانے کے قصے میں جو تین کردار حیران کرتے ہیں وہ ہماری تینوں بہنیں تھیں۔ ابی باجی اگر چہ ہماری پہلی ماں سے تھیں مگر ہمارے لئے اپنی ماں جیسی تھیں۔ ان کے بڑے بھائی نے ابا سے جتنی دوری اختیار کی، ابی باجی نے ابا کو اتنا ہی ٹوٹ کے چاہا اور اماں سے اتنی ہی شدید محبت کی۔ دوسری بہن فاطمہ بیگم تھیں جنہیں نہیں معلوم کیوں پیاری بگنا کہا جاتا تھا اور تیسری بہن یوسف جہاں بیگم تھیں جنہوں نے اماں کے بعد سارے کنبے کو اپنے بازوؤں میں تھاما۔ دوسری بہن کو ہم سب بڑی باجی اور تیسری کو چھوٹی باجی کہا کرتے تھے۔ ہماری اماں نے یہ کیا کہ پہلے تین لڑکیوں کو پال پوس کر بڑا کیا اور پھر ایک کے بعد ایک، چھ بیٹے پیدا کر کے لڑکیوں کے حوالے کرتی گئیں۔ صاف کیوں نہ کہوں، ہم سب بھائیوں کو تینوں باجیوں نے پالا۔ اسی لئے ہمارے گھرانے میں بیٹیوں کا بہت احترام رہا اور آج تک ہے۔

ابی باجی خاص طور پر میرے لئے کیا نہیں تھیں، میری تربیت، کردار سازی، خوبیوں کو ابھارنا، حوصلہ افزائی کرنا، ہمت بڑھانا اور سب سے بڑھ کر مجھ پر ناز کرنا، یہ ساری خوبیاں ان میں یکجا تھیں۔ ہوا یہ کہ آزادی کے بعد جب ہر طرف مار دھاڑ شروع ہوئی،

اگر چہ ہمارے شہر روڑکی میں کشیدگی ضرور تھی لیکن خوں ریزی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ پھر بھی ابّا نے گھر کی عورتوں اور بچّوں کو ہاپوڑ بھیج دیا جہاں میرے بڑے بہنوئی حبیب حیدر نقوی تحصیل دار تھے، تحصیل کی قلعہ نما عمارت میں رہتے تھے اور زندگی نسبتاً محفوظ تھی۔ جب حالات بہتر ہوئے تو سب لوگ واپس روڑکی چلے گئے البتہ مجھے ہاپوڑ ہی میں چھوڑ دیا گیا جہاں ابی باجی نے مجھے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس طرح میری زندگی کے ڈھائی تین سال ان کے ساتھ گزرے۔ اس وقت ان کے اپنے چھ بچّے تھے۔ ابی باجی ان کی بڑے پیار سے دیکھ بھال کرتی تھیں۔ بہنوئی پوری تحصیل کے حاکم تھے اس لئے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ان کے ہاں اصلی گھی، انڈوں، دودھ اور شہد کی بہتات تھی اور وہ جو شہر کے رئیسوں کے گھروں سے ڈالی آیا کرتی تھی تو پھلوں اور لڈو پیڑوں کے انبار لگ جاتے تھے۔ صبح اسکول جانے سے پہلے ہم سب چولہے کے گرد بیٹھتے تھے۔ باجی توے پر روغنی ٹکیاں پکاتیں اور جب انہیں کوئلوں پر سینکتیں اور وہ پھول جاتیں تو انہیں پھوڑ کر گاؤں سے آئے ہوئے اصلی گھی میں ڈبوتیں اور ایک ایک بچّے کو دیتی جاتیں۔ ایسی غذا پر پل کر ہم بڑے ہونے لگے۔ شام کو باجی ہم سب کو لے کر بیٹھتیں اور دینیات اور اردو پڑھاتیں۔ اس وقت اسماعیل میرٹھی کی کتابیں نکالی جاتیں۔ باجی بڑی سمجھ داری سے ہمیں نظمیں یاد کراتیں جو مجھے آج بھی ازبر ہیں۔ ساتھ میں چھوٹے والے بھی لگ جاتے اور سب مل کر کبھی 'تعریف اس خدا کی کرتے جس نے جہاں بنایا' اور کبھی اُس رب کا شکر ادا کرتے جس نے ہماری گائے بنائی'۔ ایک صدی پہلے موزوں کئے ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے مصرعے ہمارے ویسے ہی چھوٹے چھوٹے ذہنوں پر گہرے نقش بناتے جو آج بھی موقع محل کی مناسبت سے ابھرتے ہیں اور وہ بھی روشن حروف بن کر۔

پھر ہوا یہ کہ گھر میں ایک چھوٹا سا اسکول کھل گیا۔ باجی نے مجھے اور میرے

ہم عمر بھانجے کو جنہیں سب پیار سے افسر کہتے تھے، استاد بنا دیا۔ کم عمر بھانجوں بھانجیوں نے مستعدی سے شاگردی اختیار کر لی اور یوں تعلیم دیتے دیتے ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوا کہ ہم خود اپنی اور اپنے ذہنوں کی تربیت کر رہے ہیں۔

کلاسیں لگنے لگیں۔ امتحان ہونے لگے۔۔ اپی باجی کو ہماری کردار سازی سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اسماعیل میرٹھی سے انہیں جو لگاؤ تھا وہ نیا نہیں تھا۔ ہمیں بعد میں اندازہ ہوا کہ اس کی بنیاد ہماری پیدائش سے پہلے رکھ دی گئی تھی۔ انہوں نے خود نہیں بتایا لیکن پتہ چلا کہ بچپن میں انہیں علامہ راشد الخیری کے گھرانے کے رسالے بنات اور عصمت پڑھنے کو دیئے جاتے تھے۔ بہت عرصے بعد ہم نے پرانے وقتوں کی مشہور کتاب 'عصمتی دستر خوان' دیکھی جس میں ہندوستان بھر کی خواتین نے اپنے گھروں کے کھانے کے پسندیدہ نسخے بھیجے تھے۔ بھیجنے والیوں میں ریاستوں اور رجواڑوں کی شہزادیاں بھی شامل تھیں اور ہمارے سیدھے سادے گھرانے کی اپی باجی بھی تھیں جن کی مالیدہ اور مسقطی حلوہ بنانے کی ترکیبیں چھپیں لیکن ان کے اصل نام باقری بیگم نہیں بلکہ دختر سید اکبر علی صاحب کے نام سے۔ شاید گھر کی لڑکیوں کے اصل نام چھپوانا معیوب سمجھا گیا ہوگا۔ عصمتی دستر خوان کا پہلا ایڈیشن مارچ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا اور اب تک پچاس ایڈیشن تو ضرور چھپ چکے ہوں گے۔

ہاں تو اپی باجی کے تعلق سے ہاپوڑ کی بات ہو رہی تھی جہاں مجھے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ مل گیا۔ اسکول سے تھوڑے فاصلے پر کامرس کالج تھا جس میں ہمارے دور کے بڑے کہانی کار انتظار حسین صاحب تعلیم پا رہے تھے۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا شہر ہے۔ اس کی تفصیل آگے آنے والی ہے۔

بڑی باجی

میں جب پیدا ہوا، اپی باجی بیاہ کر جا چکی تھیں۔ اب گھر میں بڑی باجی اور چھوٹی

باجی تھیں، مجھے یاد ہے خاندان کے بزرگ چھوٹی کو ننّ اور بڑی کو منّا کہتے تھے۔ دونوں بہنیں پڑھنے جاتی تھیں۔ انہیں اسکول لے جانے کے لئے ایک ہاتھ گاڑی آتی تھی جسے ایک شخص کھینچتا اور دوسرا دھکیلتا تھا۔ ہر طرف پردہ پڑا ہوتا تھا اور اندر نہیں معلوم کتنی لڑکیاں بیٹھتی تھیں۔ بڑی باجی کو جانور پالنے کا بہت شوق تھا جو تمام عمر رہا۔ پہلے انہوں نے ایک بکری پالی جس کا نام رنگ کی مناسبت سے کلّو رکھا گیا۔ میں اسے روز آم کے باغ میں لے جاتا اور درخت کی نرم اور ملائم شاخیں ایک کٹوے کی مدد سے توڑ کر اسے کھلاتا جاتا اور اس سے باتیں کرتا جاتا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی باغ کو جاتی اور اسی طرح واپس گھر آ کر سو جاتی۔ وہ جب ذرا بڑی ہوئی تو چرواہے کی خدمات حاصل کی گئیں جو روز صبح مختلف گھروں سے بکریوں کو ہانک کر لے جاتا، بکریاں دن بھر چرتیں اور شام کو گڈریے کے باڑے میں واپس آتیں جہاں لوگ آ کر اپنی اپنی بکریاں لے جاتے۔ وہ جگہ ہمارے گھر سے کافی دور تھی اور راستہ پُر پیچ تھا۔ میں جاتا تو ریوڑ اسی وقت واپس آ رہا ہوتا تھا۔ میں ایک اونچی جگہ سے آواز دیتا۔ 'کلّو'۔ وہ گردن اٹھا کر جواب دیتی اور میرے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی گھر تک آتی۔ ایک روز خدا جانے کیا ہوا، کوئی اسے لینے نہ جا سکا۔ اچانک گلی میں کلّو کی آواز آئی۔ دیکھا وہ خود ہی گھر آ گئی تھی اور دروازے پر کھڑی آواز دے رہی تھی۔ میں نے اسے گلے سے لگایا، میں نے تو کم لگایا، وہ خود زیادہ لگی اور تھکی ہوئی تھی، ٹھنڈے فرش پر سو گئی۔ باجی کو جلدی تھی کہ وہ دودھ دینا شروع کرے۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب معلوم ہوا کہ کلّو کا پیر بھاری ہے اور خیر سے وہ امید سے ہے۔ پھر ایک روز بڑی تکلیف سے شیرا پیدا ہوا۔ وہ باپ پر پڑا، اس کا رنگ سرخ تھا۔ مجھے یاد ہے ایک روز شیرا کو بھی گھاس چرنے کو بھیجا گیا۔ شام کو گھر آیا تو بری طرح نڈھال تھا، انگنائی میں سب کے بستر لگے تھے اور چادریں بچھا دی گئی تھیں تاکہ ٹھنڈی ہو جائیں۔ سب سے

چھوٹا پلنگ میرے چھوٹے بھائی اقبال کا تھا۔ شیرا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ پلنگ پر چڑھا اور تکیے پر سر رکھ کر کروٹ لے کر سو گیا۔

اس کے بعد باجی نے گائے پال لی۔ ہم نے اس کی خدمت شروع کر دی اور زندگی میں پہلی بار اُپلے تھاپے۔ جب یہ سب نمٹ گئے تو گھر میں ایک تگڑا اور توانا مرغ پالا گیا۔ وہ بہت ہی نک چڑھا تھا کسی لاڈ پیار کے بغیر ہی بگڑا ہوا تھا۔ اس نے عجب عادت اختیار کی۔ وہ گھر کے سامنے سے گزرنے والی عورتوں کی ایڑی میں ٹھونگ مارتا تھا۔ عورتیں ادھر ہی سے گزر کر گھاٹ پر نہانے جاتی تھیں۔ بے چاریوں نے ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا۔ سنہ ۴۷ء کے خوفناک دنوں میں بقرعید کا موقع آ گیا۔ گھر میں بکرا یا دنبہ ذبح کرتے ہوئے ڈر لگا تو وہی مرغا ذبح کیا گیا۔

اس سے پہلے بڑی باجی کی شادی ہوگئی۔ انہوں نے روڑکی کا محلّہ بی ٹی گنج چھوڑ کر پرانی دلّی کے کوچہ الطاف حسین کو آباد کیا۔ اسی دوران ملک کو آزادی ملی، برصغیر کا بٹوارا ہوا۔ کسے خبر تھی کہ ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر نئے ملک کی طرف جانا ہوگا۔ اسی طرح کسی کے قیاس میں بھی نہ آیا تھا کہ جو علاقہ پاکستان کہلاتا ہے وہاں کی زیادہ تر ہندو آبادی کو بسی بسائی بستیاں چھوڑ کر آزاد ہندوستان کی طرف راہ فرار اختیار کرنی ہوگی۔ لوگ خاموشی سے چلے جاتے تب بھی غنیمت تھا۔ یہاں تو خنجر نکل آئے، تلواریں سونت لی گئیں، آگ بھڑکائی گئی، مرد مارے گئے، عورتیں اٹھائی گئیں، بچے بے موت مرے اور ایسے میں سب سے بڑی قیامت دارالحکومت دلّی پر ٹوٹی۔ اس شہر کے لوگوں نے تاریخ کو دیکھا جو خود کو دہرانے پر تلی ہوئی تھی۔ پرانی دلّی کی گلیوں میں آباد کتنے ہی مسلمانوں نے بھاگ کر پرانے قلعے کے کھنڈروں میں پناہ لی۔ وہ وہاں موسم کی سختیاں جھیلتے رہے اور ان خصوص ریل

گاڑیوں کی راہ دیکھتے رہے جن میں طے ہوا تھا کہ انہیں سرحد پار پاکستان لے جایا جائے گا۔ آخر وہ گاڑیاں چلیں اور پناہ گزینوں کے قافلے ایک ایک کر کے جاتے رہے۔ کچھ خیریت سے پار اتر گئے باقی راہ میں مارے گئے۔ کچھ ایسی ہی آفت پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں پر ٹوٹی۔ باجی والی ٹرین پر کسی کا سایہ رہا ہوگا۔ وہ لاہور پہنچ گئیں۔ باجی اور ان کے شوہر اپنے ایک دودھ پیتے بیٹے کو لے کر کراچی چلے گئے جہاں انہیں بحریہ میں چھوٹی سی کلرکی اور اسی مناسبت سے اتنا ہی چھوٹا کوارٹر رہنے کو مل گیا۔ اتنا چھوٹا کہ اس میں دو میاں بیوی اور ایک شیر خوار بچہ رہ سکے۔ کسے پتہ تھا کہ کچھ عرصے بعد اتنے بڑے کنبے والے آ کر اسی کوارٹر میں یوں سمائیں گے کہ سو تو جائیں مگر کروٹ بدلنی مشکل ہو گی۔ اُدھر روڑکی میں ہمارے بھرے پُرے گھر نے پاکستان جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کراچی میں بہنوئی نے دوڑ دھوپ کر کے ہم سب کے پرمٹ بنوائے (ان دنوں پاسپورٹ نہیں ہوتے تھے) اور باجی نے اُن ہی ڈھائی کمروں میں ہمارے رہنے سہنے کا بندوبست کیا۔ آخر سنہ پچاس کے خاتمے پر ہمارا پورا خاندان کراچی جا پہنچا گھر میں جگہ اتنی تنگ تھی کہ کچھ لوگ گھر کے سامنے چھوٹی سی بگیا میں بستر لگا کر سوتے تھے۔ وقت بدلے، حالات بھی پہلے جیسے نہ رہے۔ ناظم آباد میں ہمارا گھر بن گیا اور باجی کو گلشن اقبال میں پلاٹ مل گیا۔ انہوں نے اپنے تنگ وسائل میں جیسے بھی بنا، کچّا پکّا مکان بنایا اور اس میں بھی کچھ آدھے ادھورے کمرے بنا کر کرائے پر دے دیئے کیوں کہ دولہا بھائی کی تنخواہ بہت ہی قلیل تھی اور باجی کے ہاں بچّوں کی ولادت رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ان کے ہاں پانچ بیٹے اور بڑی منتّوں مرادوں کے بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی لیکن بچوں کے بڑے ہونے اور کسی قابل ہونے میں ابھی کئی برس درکار تھے۔ بڑی باجی نے اور کوئی کام کیا یا نہیں،

اللہ سے لو لگائے رکھی۔ محرم بڑی عقیدت سے مناتی تھیں اور ایک پاک صاف کمرے میں عزا خانہ سجا کر مجلسیں ضرور کرتی تھیں۔ ان ہی دنوں خواب میں دیکھا، کسی نے کہا 'آہو پالو'۔ صبح ہوئی تو میاں سے پوچھا کہ آہو کیا ہوتا ہے۔ بیٹے بڑے ہو گئے تھے اور اندرون سندھ ملازمتیں کرتے تھے، وہاں سے کئی ہرن لے آئے۔ ہرن بھی باجی کی طرح عزادار نکلے۔ وہ خود ہی اس کمرے میں رہنے لگے جس میں امام باڑا آراستہ تھا۔ صرف رفع حاجت کے لئے باہر جاتے ورنہ حال یہ تھا کہ ایک ہرنی تو باجی کے پیچھے پیچھے گھومتی یا ان کے قریب بیٹھی رہتی اور دوسرے ہرن اسی عبادت گاہ میں رہا کرتے۔

باجی کے معمول میں ایک عادت شامل تھی۔ وہ ہمیشہ وضو کر کے سوتی تھیں۔ ایک رات سوئیں اور صبح کمرے سے باہر نہیں آئیں۔ گھر والوں نے جا کر دیکھا، پرسکون نیند سو رہی تھیں، قریب ہی ان کی چہیتی ہرنی بیٹھی تھی۔ سب ہی نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے ابھی ابھی آنسو ٹپکا تھا۔

چھوٹی باجی

یوسف جہاں باجی اگرچہ ہم سارے بھائیوں سے بڑی تھیں لیکن چھوٹی باجی کہلاتی تھیں۔ ان کی کمر کے جوڑوں میں کچھ ایسا درد بیٹھا کہ ان کی شادی نہ ہو سکی مگر انہوں نے اپنے لئے مصروفیت ڈھونڈ لی۔ انہوں نے امّاں کا کردار سنبھال لیا۔ کراچی کے علاقے ناظم آباد کے بلاک نمبر چار میں ہمارا گھر جو شمیران کے نام سے مشہور تھا، اچھا بھلا مسافر خانہ بن گیا۔ کیا دور، کیا قریب کے سارے ہی عزیز رشتے دار کراچی آ کر پہلا پڑاؤ وہیں ڈالتے تھے۔ غرض یہ کہ شمیران سال کے بارہ مہینے رشتے داروں سے بھرا رہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں گھر میں رونق بھی بے پناہ تھی۔ خاص طور پر چھٹّی

والے دن تو وہاں میلے کا سماں ہوتا تھا۔ خاندان کے دوسرے لوگ بھی اس روز شمیران آجاتے اور پھر جو منظر دوپہر کے کھانے کے وقت ہوتا تھا وہ یاد رہے گا۔ اکثر کھانے والے نوجوان ہوتے جو گھنٹوں کی خوش گپّیوں، کھیل کود اور دھما چوکڑی کے بعد جب کھانے پر بیٹھتے تو ان کی بھوک ذرا زیادہ ہی کھلی ہوئی ہوتی تھی۔ باجی پتیلا بھر کر پکاتیں جو دیکھتے دیکھتے چٹ ہوجاتا۔ ایسے میں میری مرحومہ ساس کہا کرتی تھیں کہ تم لوگوں کے پیٹ ہیں یا خندق۔ مگر کبھی کسی کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ اوپر سے غضب یہ کہ چھوٹی باجی کے ہاتھ میں ذائقہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ مٹر پلاؤ ہو یا طاہری (تہری)، اس کی مہکتی ہوئی قابیں میز آتیں تو سب کی بھوک کھل جاتی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ باجی اپنے ہاتھ کا ذرا سے میل بھی ڈال دیں تو کھانا مزے کا ہو جاتا تھا۔ ہم نے ویسا آلو گوشت کا سالن پھر کبھی نہیں کھایا۔ مجھے یاد ہے، عید بقر عید ہو یا محرم یا نذر نیاز ہو یا کونڈے یہاں تک کہ گرمیوں، سردیوں اور برساتوں کے مخصوص کھانے ہوں، چھوٹی باجی ہی سب کی تیاریوں میں منہمک ہوا کرتی تھیں۔ (اور بارہ رجب کی ٹکیاں تلنے کے دوران اگر کھِل جاتیں تو شرمندہ بھی بے چاری باجی ہی ہوا کرتی تھیں)۔

اتنے بڑے کنبے کے اتنے بہت سے افراد کا خیال رکھنے کی ذمے داری باجی نے خود ہی اپنے سر لے لی۔ بڑے تو اپنی دیکھ بھال خود کر لیتے تھے لیکن چھوٹوں کے معاملات کو دیکھنا آسان نہ تھا۔ باجی کو ان سب کی فکر رہتی تھی۔ ان کو اسکول بھیجنا، کھانے پینے کا خیال رکھنا اور آئے دن ان کی دوا علاج کا بندوبست کرنا باجی ہی کی ذمے داری تھی۔ ہمارے ڈاکٹر فضل عباس کا یہ معمول تھا کہ کوئی بچہ ان کے پاس لے جایا جاتا تو ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ باجی سے پوچھ کر بچے کا دوا علاج خود ہی کرلو۔ سچ بھی یہی ہے کہ کان کے درد سے لے کر پیٹ کی تکلیف تک ہر مرض کی دوا باجی کے پاس تھی۔ لڑکپن کے دنوں میں ایک بار

میری ایک ٹانگ میں بڑا زخم آیا۔ وہ ہر طرح کے علاج کے باوجود بھر نہیں رہا تھا۔ باجی نے کہا کہ زخم کو کھولو، دھوپ میں بیٹھو اور اسے ہوا لگنے دو۔ وہ زخم دیکھتے دیکھتے بھر گیا۔ روڑکی میں ہمارے گھر میں مرغیاں پلی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار مرغیوں کی کوئی بیماری پھیلتی اور وہ مرجاتیں۔ بیماری کی پہلی علامت یہ ہوتی کہ مرغیاں سست ہوجاتیں اور ان کا کھایا ہوا دانہ ہضم نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کا معدہ، جسے پوٹا کہا جاتا تھا، بھرا رہتا تھا۔ باجی نے قینچی اٹھا کر ان کے پوٹے کاٹے، پیٹ خالی کیا اور سوئی دھاگے سے ٹانکے لگا دیئے۔ مرتی ہوئی مرغیاں جی اٹھتیں اور جو کوئی باجی کا کارنامہ سنتا، یقین نہ کرتا اور پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستا۔ اس طرح کی جدّتیں دیکھ کر لوگوں نے ان کا نام جدّت باجی رکھ دیا۔

یہ سب تھا، ساتھ ہی ان کی کمر کی تکلیف ان کی جان کے ساتھ لگی رہی لیکن کبھی نہیں ہوا کہ وہ بستر سے لگ گئی ہوں۔ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ اگر ایک بار لیٹ گئی تو پھر اٹھنا مشکل ہوگا۔ عمر کے ساتھ باجی کی تکلیفیں بھی بڑھتی گئیں۔ انہیں ذیابیطس ہوگئی۔ باجی نے اس کا علاج خود ہوشروع کردیا اور کثرت سے شہد کا استعمال کرنے لگیں۔ مرض بڑھتا گیا۔ ان کی بھانجیوں نے ان کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کی یادداشت جاتی رہی اور پہلی بار انہوں نے ہمّت ہار دی۔ آخر وہ خاموشی سے سدھار گئیں۔ باجی کو نہ صرف خاندان کے بلکہ ملک کے غریب بچّوں کو تعلیم دلانے کا بہت شوق تھا۔ ان کے انتقال کے بعد خاندان کے سارے ہی بچّوں نے، جو خیر سے صاحب حیثیت ہوگئے ہیں، ان کے نام سے یوسف جہاں ایجوکیشن فنڈ قائم کردیا ہے جس میں وہ دنیا کے مختلف کونوں سے اپنے حصے کی رقم ڈالتے رہتے ہیں جس سے ضرورت مند گھرانوں کے درجنوں جوانوں کی تعلیم ہورہی ہے۔ یقین ہے باجی جہاں بھی ہوں گی، خوش ہوں گی۔

گوروں نے گنگا کاٹ لی، کیسے؟

وہاں جہاں یو پی کے میدان ختم ہوتے تھے اور جہاں ہمالیہ شروع ہوتا تھا، وہاں خدا جانے کب سے بہنے والی سولانی ندی کی کشادہ وادی کے اونچے کناروں پر ایک چھوٹا سا شہر آباد تھا، روڑکی۔ پرسکون، خاموش اور ٹھہرا ٹھہرا سا۔ وہاں اگر کوئی چیز رواں تھی تو شہر کے بیچوں بیچ بہنے والی نہر اور اگر کوئی شور تھا تو جاڑوں میں پہاڑوں سے اتر کر آنے والے طوطوں کا۔ بس کبھی کبھی نہر کے ہلکے ہلکے تھپیڑے سنائی دیتے تھے، وہ بھی رات کے سناٹے میں۔ نہر کے ایک کنارے پر بستی کی رونق اور دوسری طرف کچھ چھاؤنی کا دبدبہ اور کچھ شاندار انجینئرنگ کالج کے دور دور تک پھیلے ہوئے قالینوں جیسے سبزہ زار۔ جب یہ سب نہیں تھا تو روڑکی کچے مکانوں کی بستی تھی اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس کا پرانا نام 'روڑی' تھا۔ اس علاقے میں راجپوت سرداروں کی عملداریاں تھیں اور ان ہی میں سے ایک کی بیوی کا نام روڑی تھا۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں یہ ایک پرگنے کے صدر مقام تھا اور کہتے ہیں کہ آئین اکبری میں اس کا ذکر موجود ہے۔ میں نے اس کے گلی کوچوں میں کئی برس گزارے، مجھے پرانے زمانوں کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک کوئی راجا رام دیال تھے جن کا سنگھاسن شہر سے ذرا

پرے ایک گمنام سے علاقے لنڈھورے میں تھا۔ یہ سارا علاقہ ان کا تھا۔ وہ سنہ ۱۸۲۳ء میں چل بسے اور علاقے کے گاؤں دیہات راجپوت سرداروں میں بٹ گئے۔ میرے زمانے میں لنڈھورے سے لوگ روزگار کے لئے روڑکی آیا کرتے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ جوں ہی انیسویں صدی شروع ہوئی روڑکی کے بھاگ جاگے۔ انگریز حکمراں اب کلکتے سے نکل کر دور دور تک پھیل رہے تھے۔ انہیں روڑکی کی کوئی ایسی ادا بھائی کہ انہوں نے یہاں اپنی چھاؤنی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر چالیس بیالیس سال بعد علاقے کا بھلا چاہنے والوں نے ایک اور بڑا فیصلہ کیا۔ انہوں نے طے کیا کہ گنگا جو صرف تیس کیلومیٹر دور ہے، وہاں سے ایک نہر نکالی جائے جو اس نہایت زرخیز سرزمین کو سیراب کرے، وہی زمین جو نہ جانے کب سے فصلوں اور پھلوں کی دولت اگلنے کو بے چین تھی۔ پیمائش کا کام شروع ہوگیا۔ نہر کی تعمیر، مرمت اور دیکھ بھال کے لئے وہاں کینال ورکشاپ اور آئرن فاؤنڈری بنی جس کی اونچی چمنی آج تک سر اٹھائے کھڑی ہے اور جہاں ہم صبح و شام کام شروع اور ختم ہونے کے سائرن سنا کرتے تھے۔ یہ بہت بڑا کارخانہ مجھے دو باتوں کو وجہ سے یاد رہے گا۔ ایک یہ کہ اٹھارہ سوستاون کی تاریخی بغاوت میں جب ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں پر حملے شروع کئے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی نشانہ بنایا تو ان لوگوں نے اسی کارخانے کے تہہ خانے میں چھپ کر پناہ لی تھی۔ انہیں وہاں پناہ دلوانے والوں میں سرسید احمد خاں کا نام بھی سننے میں آتا تھا۔ دوسری وجہ دل چسپ ہے۔ ہوا یہ کہ روڑکی کے واحد سنیما گھر 'روڑکی ٹاکیز' کی عمارت کو کچھ عرصے کے لئے بند کرنا پڑا تو شہریوں کی تفریح کے خیال سے ورکشاپ کے اسی تہہ خانے میں کچھ صفائی وغیرہ کر کے سنیما گھر قائم کر دیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ تماشائی پورے وقت ٹانگیں اٹھائے بیٹھے رہتے تھے

کیونکہ تہہ خانے کے فرش پر سانپوں بچھوؤں کا راج تھا۔

انگریزوں کو ترقیاتی کاموں کے لئے سینکڑوں انجینئر درکار تھے جو انگلستان سے لانے مشکل تھے۔ انہوں نے روڑکی میں سول انجینئرنگ اسکول قائم کیا۔ کسی کو یاد نہیں کہ وہاں پہلے پہل تعلیم اردو زبان میں ہوتی تھی۔ اس کے لئے وہاں چھاپہ خانہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ میں نے اس زمانے کی کچھ اردو کتابیں یہاں لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں دیکھی ہیں۔ کچھ عرصے بعد یہی اسکول مشہور و معروف ٹامسن کالج آف سول انجینئرنگ بن گیا اور ملک کے نوجوان انجینئرنگ کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے کہاں کہاں سے چل کر روڑکی پہنچے۔ سوچئے ان میں کون کون شامل تھے، امراؤ جان ادا کے مصنف مرزا محمد ہادی رسوا، اردو پڑھانے کی بے مثال کتابوں کی مصنف مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور میرے والد میر اکبر علی مرحوم۔

میری نہر

ذرا سوچئے کہ جس شہر کے بیچوں بیچ گنگا کے میٹھے اور ٹھنڈے پانی کی نہر گزرتی ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ اس شہر کے لڑکے اس پانی میں پاؤں بھی نہ ڈالتے ہوں۔ سچّی بات یہ ہے کہ ہمارے گھر کا یہی چلن تھا۔ روڑکی کی نہر کے بارے میں مشہور تھا کہ ہر سال ایک جوان لڑکے کی قربانی لیتی ہے۔ ہماری امّاں کے تو خیر سے چھ بیٹے تھے، ان سب کو حکم تھا کہ خبردار جو کسی نے نہر میں پاؤں بھی ڈالا۔ چنانچہ لہریں لیتی بالائی گنگا کی نہر کے کنارے رہنے والے ہم سارے بھائی سوکھے ہی رہے۔ لڑکے بھینٹ چڑھیں یا نہ چڑھیں، یہی ہرے ہرے سے پانی والی نہر روڑکی کی شان تھی۔ یہ ہندوؤں کے مقدس مقام ہردوار میں ہرکی پور کے قریب سے نکالی گئی تھی

جہاں سے یہ روڑکی اور پھر میرٹھ اور بلند شہر کو چھوتی ہوئی ضلع علی گڑھ میں کانپور اور اٹاوہ نامی شاخوں میں بٹ کر گنگا اور جمنا میں اتر جاتی ہے۔

اب سنئے یہ نہر نکالنے کا سودا ہمارے زمانے کے کس فرہاد کے سر میں سمایا۔ یہ انگلستان سے آئے ہوئے انجینئر ٹامس کاٹلی صاحب تھے جنہوں نے ہندوستان کی یہ زرخیز زمین دیکھی اور یہ بھی دیکھا کہ یہاں کی مٹی کو پانی مل جائے تو وہ پیداوار اگلے گی۔ یہ سنہ ۱۸۴۰ء کی بات ہے۔ یوپی کے میدانوں کے سارے نشیب وفراز اس کی نگاہ میں تھے اور اس کی چشم تصور ان میدانوں میں لہریں لیتی نہر دیکھ سکتی تھی۔ کاٹلی نے حکام کے آگے منصوبہ رکھا کہ یہاں ایک نہر نکالی جائے۔ اسے پورا یقین تھا کہ اُس کا اتنا مفید اور کارآمد منصوبہ رد نہیں ہوسکتا۔ اسی یقین کے ساتھ اس نے کسی اعلان کا انتظار کئے بغیر اپنا کام شروع کردیا۔ وہ پورے چھ مہینے تک کبھی اپنی دو ٹانگوں پر اور کبھی گھوڑے کی پشت پر اس علاقے میں گھومتا رہا بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کی خاک چھانتا رہا۔ اس نے علاقے کے چپے چپے کی پیمائش کی، ہر مقام اور ہر ٹھکانے کو ناپا اور اعلان کیا کہ میں یہاں پانچ سو کیلو میٹر لمبی نہر کھود سکتا ہوں۔ اس کی راہ میں رکاوٹیں بہت تھیں، خاص طور پر پیسے کی کمی۔ مگر وہ اڑا رہا، کبھی رپورٹیں لکھتا، کہیں تقریریں کرتا، آخر ایسٹ انڈیا کمپنی نے، جسے اُن دنوں کمپنی بہادر کہا جاتا تھا، کہا کہ ٹھیک ہے، تمہیں اتنا ہی یقین ہے تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

اس راہ میں ایک بڑی رکاوٹ مقدس ہردوار کے متبرک تیرتھ کے سادھو تھے جن کا کہنا تھا کہ یہ گورے لوگ گنگا جل کو ناپاک کردیں گے۔ انہیں بہت سمجھایا گیا۔ نقشے دکھائے گئے اور بتایا گیا کہ نہر اصل تیرتھ سے بہت فاصلے پر ہوگی لیکن وہ نہ مانے۔ سرکاری ریکارڈ میں تو نہیں لکھا لیکن علاقے میں جو خبر پھیلی میری کمسنی تک

اس کی گونج سنائی دیتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک روز کاٹلی صاحب نوٹوں سے بھرا سوٹ کیس لے کر ہردوار گئے اور واپسی میں خوش خبری لائے کہ سادھو لوگ مان گئے ہیں۔اس پر ہر طرف دھوم مچ گئی کہ 'کاٹلی صاحب نے گنگا کاٹ لی'۔وہ بھی بڑا ہی سیانا تھا۔نہر نکالنے کے لئے جب دریا پر بند باندھا گیا تو اس کا افتتاح کوئی فیتہ کاٹ کرنہیں بلکہ گنیش جی کی پوجا سے کرایا۔

نہر کی کھدائی اپریل ۱۸۴۲ء میں شروع ہوئی۔کھدائی کے ساتھ ساتھ لاکھوں اینٹیں بنانے کا مرحلہ تھا۔کاٹلی نے مختلف علاقوں میں ل اپنی بھٹیاں بنائیں، گارا بنایا اور لکڑی کے سانچوں میں اینٹیں ڈھالنے کا کام شروع کردیا۔اس کام میں کئی ہزار مزدوروں کو روزگار مل گیا۔ وہ بھی چالاک ہوگئے اور طرح طرح کے مطالبے کرنے لگے۔ ہڑتالیں ہوئیں اور کام بھی بند ہوا۔کاٹلی ان سے بھی نمٹتا رہا اور کھدائی کے کام کی نگرانی بھی کرتا رہا۔ یہاں اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سر اٹھائے کھڑی تھی۔نہر کے راستے میں سولانی ندی کی کشادہ وادی حائل تھی۔ بلندی پر تو نہر کھودنا آسان تھا پر نشیبوں میں نہر کے دونوں کنارے پشتوں کی طرح اونچے اٹھانے تھے۔کاٹلی نے بڑا کام کیا۔ جہاں جہاں نہر کھودی جارہی تھی وہاں کی مٹی اٹھا کر نشیب کو اونچا اٹھانا شروع کیا۔مٹی ڈھونے کی مشینیں ابھی نصیب نہیں تھیں۔اتنا بڑا کام خچروں سے لینا ممکن نہ تھا کہ اس میں ایک عمر لگ جاتی۔ریل گاڑی کا اس علاقے میں کہیں وجود نہ تھا۔اب کاٹلی نے ایک بہت ہی بڑا کام کیا۔ اس نے انگلستان سے ریل کا انجن اور مال گاڑی کے ڈبّے منگا لئے اور ہندوستان کی سرزمین پر تاریخ میں پہلی بار روڑکی سے پیرانِ کلیر کی زیارت گاہ تک باربردار ٹرین چلا دی۔ یہاں حضرت علاءالدین صابر نے پڑاؤ ڈالا تھا اور یہیں آسودہءخاک ہیں۔یہی وہ

تاریخی جگہ ہے جہاں ایک خلقت اپنی مرادیں لے کر حاضر ہوتی ہے۔اس ریل گاڑی کی کہانی بہت دلچسپ ہے اس لئے آگے بیان کروں گا

سولانی ندی کے اوپر سے ایک بڑی نہر گزارنے کے کام شروع ہو گیا۔ندی کے اوپر سولہ دروں کا وہ پل بنایا گیا جس کے نیچے ندی اور اوپر نہر بہتی ہے۔ہم لڑکپن میں سولانی ندی کا یہ حیرت انگیز پل دیکھنے جایا کرتے تھے اور ایک عجیب منظر دیکھا کرتے تھے کہ سولہ دروں کی چھت سے پانی کی بوندیں رات دن ٹپکا کرتی تھیں۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ جس روز بوندیں ٹپکنی بند ہو جائیں، پُل گر پڑے گا۔اس طرح کے قصے کہانیاں ہر عجوبے سے وابستہ ہوا کرتی ہیں۔

اس دوران وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔کاٹلی بیمار ہو گیا اور اسے تین سال کے لئے انگلستان جانا پڑا۔آخر آٹھ اپریل ۱۸۵۴ء کو اس میں پانی چھوڑا گیا اور نہر کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔اس سے ساڑھے سات لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین اور پانچ ہزار دیہات سیراب ہونے لگے ٹامس کاٹلی ہی کی کوششوں سے روڑکی میں ٹامسن کالج آف سول انجینئرنگ قائم ہوا جو اب انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کے نام سے عظیم ادارہ بن گیا ہے۔اس کے بہت بڑے بورڈنگ ہاؤس یا اقامت گاہ کا نام Cautley کے نام پر رکھا گیا ہے جہاں اس کا نہایت دلکش مجسمہ رکھا ہے۔اس کی جبیں سے جو عزم و ارادہ جھلکتا ہے وہ دیکھنے کے لئے آپ کو روڑکی جانا ہوگا۔اب میرے جانے کی روداد سنئے۔

میرا روڑکی کا سفر

میں بی بی سی کی اردو سروس کے لئے اپنا دستاویزی پروگرام تیار کر رہا تھا جس

کا تعلق ریلوے کے نظام سے تھا۔ تحقیق کے دوران یہ معلوم کر کے میں خوشی اور حیرت سے اچھل پڑا کہ برِ صغیر کی تاریخ میں پہلی بار ریل گاڑی میرے شہر روڑکی میں چلی تھی۔ اس تعلق نے میری دلچسپی بڑھا دی اور میں نے مزید کھوج لگائی تو پتہ چلا کہ بھاپ سے چلنے والے اس انجن کے پرزے برطانیہ سے سمندری جہاز میں ہندوستان کے ساحل تک لائے گئے اور دریائی بجروں، اونٹوں اور بیل گاڑیوں پر لاد کر روڑکی پہنچائے گئے جہاں انجینئرنگ کالج کے کاریگروں نے وہ پرزے جوڑ کر انجن تیار کیا۔ اس وقت کے پنجاب کے حاکم ٹامسن کے نام پر اس کا نام ٹامسن رکھا گیا۔ مٹی اور پتھر ڈھونے کے لئے شہر کی فاؤنڈری سے کلیر شریف تک پٹری ڈالی گئی۔ انجن کچھ عرصے کام کرتا رہا، پھر کیا ہوا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کچھ کتابوں میں لکھا تھا کہ انجن یادگار کے طور پر روڑکی کی انجینئرنگ یونی ورسٹی کے عجائب گھر میں کھڑا ہے۔

میں اسے دیکھنے کے اشتیاق میں روڑکی جا پہنچا اور پہلی بار اس درسگاہ میں قدم رکھا جہاں میرے والد نے تعلیم پائی تھی۔ انگریزوں کی بنائی ہوئی شاندار عمارت میں بڑی رونق نظر آئی۔ میں نے سب سے زیادہ معقول نظر آنے والے ایک صاحب سے یونی ورسٹی کے میوزیم کا پتہ پوچھا۔ میری بات سن کر وہ حیران ہوئے اور بولے کہ یہاں تو کوئی عجائب گھر نہیں ہے۔ مجھے یقین نہ ہوا تو کئی حضرات سے دریافت کیا۔ سب کا ایک ہی جواب تھا کہ یہاں کوئی میوزیم نہیں۔ آخر ایک صاحب ملے جنہوں نے میری پوری بات سنی اور مدد کی۔ انہوں نے کہا کہ آپ ورکشاپ کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر گپتا کے پاس چلے جائیے۔ انہیں ضرور خبر ہوگی کہ تاریخی اسٹیم انجن کہاں رکھا ہے۔ انہوں نے مسٹر گپتا کے دفتر کا راستہ بھی دکھا دیا۔ میں وہاں پہنچا اور ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے مسٹر گپتا یوں بیٹھے تھے جیسے فائلوں اور کاغذوں کے

انبار سے انہوں نے مورچہ بنا رکھا ہو۔ اس انبار کے پچھواڑے ایک گھریلو ساخت کا ریڈیو جیسا آلہ رکھا تھا جس میں سے اونچا ایریل نکلا ہوا تھا۔

میں نے انہیں اپنے آنے کا سبب بتایا کہ اُس تاریخی اسٹیم انجن کی تلاش میں ہوں جو ۱۸۵۱ء یہیں چلایا گیا تھا۔ میری بات سن کر وہ بہت محظوظ ہوئے اور بولے کہ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ بالکل یہی بات کہتے ہوئے کتنے ہی گورے اور رنگ دار لوگ یہاں آ چکے ہیں۔ ہم نے ان سب کو ایک ہی جواب دیا کہ وہ تاریخی انجن کہیں گم ہو گیا ہے۔ وہ ہماری یونی ورسٹی میں تو نہیں، یا تو بنگلور چلا گیا یا چندی گڑھ چلا گیا یا، آرمی والے لے گئے۔ آخر میں بولے ''مجھے لگتا ہے وہ کہیں گم ہو گیا ہے''۔

میں نے مسٹر گپتا کی میز پر سجے ہوئے ریڈیو سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ معلوم ہوتا ہے آپ الیکشن کی خبریں شوق سے سن رہے ہیں۔ انہوں نے عجیب بات بتائی۔ کہنے لگے کہ ویسے تو میں انجینئر ہوں لیکن روحانیت پر بھی میرا ایمان ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ووٹر کے لاشعور میں اپنا روحانی پیغام اتار کر اسے بی جے پی کا حامی بنا سکتا ہوں۔ یہ میرا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ اس میں میرا ایک پیغام محفوظ ہے جو لوگ سن تو نہیں سکتے لیکن یہ پیغام آپ ہی آپ سننے والوں کے دل و دماغ میں اتر جاتا ہے۔ اس طرح میں ان کے لاشعور کو بی جے پی کا حمایتی بنا رہا ہوں۔ اب اگر اس علاقے کا ہمارا امیدوار جیت گیا تو میں سمجھوں گا کہ میرا یہ ٹرانسمیٹر اپنا کام کر رہا ہے۔

مسٹر گپتا کی بات ختم ہوئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ان سے ہاتھ ملایا اور دل ہی دل میں کہا کہ یہاں صرف اسٹیم انجن ہی نہیں، بہت کچھ گُم ہو گیا ہے۔

اب سنئے دل چسپ بات۔ اسی یونی ورسٹی کی لائبریری میں خاک دھول میں

اٹی ہوئی ایک پرانی کتاب کسی کے ہاتھ لگی۔ اس میں ٹامس کاٹلی نے اپنے انجن کا احوال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ انجن کئی مہینے کام کرتا رہا۔ پھر ایک روز اسے آگ لگ گئی اور وہ تباہ ہو گیا۔ چلئے قصہ ختم ہوا۔ لوگ کتاب نہیں پڑھتے ورنہ یونی ورسٹی میں گورے اور رنگ دار لوگوں کی آمد نہ ہوتی جو انجن ڈھونڈتے ہوئے آئے دن وہاں چلے آتے ہیں۔

نہر کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہ محض پانی کی گزر گاہ ہی نہیں، اس کے پختہ کناروں پر دل کش سیڑھیاں پانی میں اترتی ہیں نہر کے ساتھ ساتھ خوش نما منڈیر چلی جاتی ہے۔ جس جگہ نہر کے اونچے اٹھائے ہوئے کنارے ختم اور شروع ہوتے ہیں وہاں دونوں سروں پر سیمنٹ کے چار شیر بیٹھے ہیں جن کے ماڈل لندن کے ٹریفلگر اسکوئر میں بھی تعمیر کئے گئے ہیں۔ مستورات کے گھاٹ، مویشی گھاٹ، اور باربردار کشتیوں کو کھینچنے والے محنت کشوں کے لئے کنارے کنارے پختہ راستے، یہ سب سونے جیسی رنگت کی سیمنٹ سے بنائے گئے ہیں۔ یقین تو نہیں لیکن ہم نے ہمیشہ یہ سنا کہ اس پلاسٹر میں ماش کی دال، گُڑ اور اینٹوں کا چورا ملایا گیا تھا۔ کاٹلی نے صرف یہ نہیں کہ نہر بنائی بلکہ یوں لگتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اور بڑے پیار سے بنائی۔

اب نہر کے کچھ اور قصے۔ دھیمی چال چلنے والی یہ نہر کبھی کبھی بپھرتی بھی تھی اور اس کی برہمی سے خوف آتا تھا۔ علاقے میں شدید بارشوں کے بعد روڑکی کی اس نہر میں طغیانی آجاتی تھی۔ اس وقت یہ نہر اپنے ساتھ کیا کیا بہا کر لاتی تھی، یہ ذرا بعد۔ پہلے یہ بتادوں کے شدید بارش ہوتے ہی باغ میں آم کے پودے پھوٹ پڑتے تھے، لڑکے مٹّی میں دبی ان کی جڑیں یعنی گٹھلیاں نکال کر اور اندر کی گری کو پتھر پر گِھس کر پپیہے بناتے اور منہ میں دبا کر پپیہے کی آوازیں نکالا کرتے تھے۔ اسی دوران خبر پھیل جاتی کہ بالائی علاقوں سے سیلاب کا پانی نہر میں آرہا ہے جس کے ساتھ گاؤں

دیہات والوں کا سامان، یہاں تک کہ مال مویشی بھی بہے چلے آرہے ہیں۔ اس پر شہر کی آبادی پُل کر اوپر پہنچ جاتی اور سینکڑوں لوگ منڈیر کے اوپر سے جھک کر نہر کا نظارہ کرنے لگتے۔ سب سے پہلے پورے پورے چھپّر بہتے نظر آتے، اس کے بعد کپڑے لتّے، جوتے چپلیں، پھر ٹین کے ٹرنک اور اس کے بعد دکھ بھرے منظر ہماری نگاہوں کے آگے تیرتے ہوئے گزرتے۔ پھر اکا دکّا لاشیں بہتی نظر آتیں۔ مردوں کی لاشیں چت اور عورتوں کی پیٹ کے بل۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ قدرت کو ان کا پردہ منظور ہے۔ اس کے بعد مویشی نظر آتے، اکثر مردہ، لیکن جو زندہ بھیڑ بکریاں اور گائے بھینسیں بے بسی کے عالم میں بہتی ہوئی آتیں وہ پل کے اوپر مجمع کو دیکھ کر مدد کے لئے پکارتیں۔ مگر جو منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا وہ تیز بہاؤ میں تیرتی ہوئی وہ کھاٹ تھی جس پر ایک دودھ پیتا بچہ لیٹا اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ اسے دیکھ کر لوگوں نے نوجوانوں کو للکارا کہ وہ کود پڑیں اور بچّے کو نکالیں لیکن مجھے یاد نہیں کہ کسی نے ہمّت کی۔ ایسی ہی طغیانی میں ایک مرتبہ ایک بڑی کشتی بہتی ہوئی آئی اور پل کے ایک ستون سے خدا جانے کیسے الجھ گئی۔ اسے نکالنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ پھنسی رہی۔ اس کے علاوہ وہ لہروں کے ساتھ مسلسل ستون سے ٹکریں مار رہی تھی۔ معاملہ سنگین ہوا تو ماہرین بلائے گئے جنہوں نے کشتی کو بارود کے دھماکے سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

لیکن اچھے دنوں میں یہی نہر بڑے دلکش اور خوش نما منظر بھی دکھاتی تھی۔ روڑکی کی اس نہر میں کشتی رانی کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ انجینئرنگ کالج کے خوش وضع اور خوش لباس لڑکے بڑے ہی منظّم انداز میں چپّو چلاتے تھے، بالکل ویسے ہی جیسے لندن میں آکسفرڈ اور کیمبرج کے لڑکوں کا کشتی رانی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ سنا ہے کرسمس کے موقع پر چھاؤنی اور کالج کے انگریز باشندے نہر کے کنارے پانی پر جھکی ہوئی بلّی

(پول) گاڑ کر اس کے اوپر بہت سی چکنائی مل دیتے تھے اور بلّی کے آخری سرے پر روپئوں سے بھری ایک پوٹلی لٹکی ہوتی تھی اب گورے جوانوں کو بلّی پر چڑھ کر وہ تھیلی حاصل کرنی ہوتی تھی لیکن وہ پھسل پھسل جاتے تھے، البتہ جب کوئی کامیاب ہو جاتا تو خوشی اور شاباشی کے نعرے لگتے تھے۔ خیال ہے پھر پوٹلی کی رقم سے شمپین کی بوتل کھلتی ہوگی۔

ایک موقع ایسا بھی آتا تھا جب نہر دلہن کی طرح سجائی جاتی۔ دسہرے کے موقع پر اور رام لیلا کے سلسلے میں وہ منظر دکھایا جاتا تھا جب رام چندر جی بن باس سے واپس ایودھیا آتے تھے۔ وہ ایک بے حد سجے دھجے بجرے پر بیٹھ کر نہر کو پار کر کے شہر میں داخل ہوتے جہاں دلہن بن کی بیٹھی سیتا ان کی راہ دیکھ رہی ہوتی۔ اس لمحے ایک میلے کا سماں ہوتا اور رام چندر جی پر رات بھر بھیگی مونگ کے پھوٹے ہوئے انکھوے نچھاور کئے جاتے۔ راہ میں کھڑی عورتیں ملاپ کے گیت گاتیں اور ذرا سا ناچ بھی لیتیں۔

ایک بار کہیں سے تیراکوں کی ایک ٹولی روڑکی آئی۔ وہ لوگ نہر میں اپنے ہنر کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انہوں نے طرح طرح کے پینترے دکھا کر روڑکی والوں کو حیران کر دیا۔ آخر میں ان کے استاد نے جو بہت بوڑھے تھے، تیراکی کا عجب کمال دکھایا۔ انہوں نے خود کو ایک بوری میں بند کر لیا اور وہ بوری پانی کی سطح پر ڈال دی گئی۔ بڑے میاں نے دم سادھ لیا یا خدا جانے کیا کیا کہ وہ پانی پر ایسے تیرتے رہے جیسے کوئی ہلکی پھلکی چیز بہی چلی جا رہی ہو۔

نہر کا ایک اور دلچسپ قصہ مجھے یاد ہے۔ روڑکی کے ایک رئیس متھر اداس کے پاس سواری کی ہتھنی تھی جسے لے کر مہاوت کبھی کبھی نہر پر جاتا تھا اور وہ پانی میں اتر

کر نہایا کرتی تھی۔ایک روز یوں ہوا کہ ہتھنی کسی بات پر ناراض ہوگئی۔وہ نہر میں اتری لیکن پھر باہر نکلنے سے انکار کر دیا۔تین دن تک مہاوت اس کی خوشامد کرتا رہا۔آخرکار خبر آئی کہ روٹھی ہوئی ہتھنی مان گئی ہے اور پانی سے نکل آئی ہے۔مجھے یاد نہیں وہ کیسے مانی، میرا خیال ہے کہ کہیں سے کوئی ہاتھی لایا یا ہوگا۔اسی نے ہتھنی کے ناز نخرے اٹھا کر اسے پانی سے باہر نکالا ہوگا۔اور تو کوئی تدبیر میرے ذہن میں نہیں آتی۔

اس نہر کے کنارے سال کے سال جو میلہ لگتا ہے اس کے ذکر کے بغیر روڑکی کی بات مکمل نہیں ہوسکتی۔ملک کا یہ علاقہ یوں بھی شہرت پا چکا ہے کہ روڑکی سے آٹھ نو کیلومیٹر دور حضرت علاء الدین صابر کا مقبرہ ہے جو یوں بہت مقبول ہے کہ اپنی مرادیں لے کر دنیا بھر کے زائرین یہاں آتے ہیں۔ان ہی کی وجہ سے یہاں کے ریلوے اسٹیشن کو اہمیت حاصل ہے۔یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ صابر صاحب کا مزار نہر کے پہلو میں ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نہر ان کے پہلو سے نکالی گئی ہے۔وہاں جانے کے لئے نہر کے کنارے کنارے کیا جانے والا سفر بہت ہی خوش گوار ہے۔اور پھر وہاں جو میلہ لگتا ہے اس کی اب کتنی دھوم ہے، مجھے پتہ نہیں لیکن مجھے اپنے لڑکپن میں کئی مرتبہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ایسی دھوم میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔وہاں جو دکانیں اور طعام خانے کھولے جاتے تھے ان کی تصویر آج بھی نگاہوں میں گھومتی ہے۔خاص طور پر میرٹھ کے کباب پراٹھے جنہیں کھانے کے لئے ایک خلقت وہاں جاتی تھی۔دوسرے بریلی کے محمد ہاشم سرمے والوں کے اسٹال میں ہزار طرح کی سرمے دانیاں خوب ہی چمکتی تھیں۔ان ہی دنوں سونے جیسی کسی دھات کے زیور بننے لگے تھے جسے رولڈ گولڈ کہا جاتا تھا۔ان کا جو اسٹال میلے میں سجایا جاتا تھا وہ رات کی تیز روشنیوں میں کچھ یوں چمکتا دمکتا تھا کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔

مجھے وہاں میرے بڑے بھائی سائیکل پر بٹھا کر میلے میں لے جاتے تھے اور ان کے طفیل مجھے ان خیموں اور شامیانوں میں جھانکنے کا موقع مل جاتا تھا جن کے اندر کی چمک دمک کے آگے کیا بریلی کی سرمہ دانیاں اور کیا رولڈ گولڈ کے زیور، سب ماند تھے۔ ان سجے دھجے شامیانوں کے اندر ملک کی چوٹی کی طوائفوں کے ڈیرے جمے ہوتے تھے اور مجرے جو سماں باندھ رہے ہوتے تھے ان کا لطف لینے کی اس وقت تک میری عمر نہ تھی۔ میرے بھائی دو چار بہت ہی مشہور طوائفوں کو جانتے تھے اور ان کا ذکر کرتے تھے لیکن مجھے ان کے نام یاد نہیں رہے، جوانی میں گیا ہوتا تو ان کا پورا شجرہ تک یاد کر کے لے آتا۔

نہر کے ایک کنارے پر صابر صاحب کی درگاہ اور دوسرے پر شاید ان کے چھوٹے بھائی کا مقبرہ تھا، ان دونوں ہی کی وجہ سے وہ جگہ پیرانِ کلیر کہلاتی تھی۔ انہوں نے پڑاؤ ڈالنے کے لئے ہندوؤں کے مقدس مقام ہردوار کا علاقہ کیوں چنا، مجھے اندازہ نہیں۔ مجھے صرف ایک بار کلیر سے آگے جانے کا اتفاق ہوا جہاں میں نے دریا سے نہر کاٹنے کی انجینئرَ ی کے کمالات دیکھے۔ اب تو اس تاریخی نہر کی تہہ میں اتنی ریت بھر گئی ہے کہ کئی مقامات پر اس کے پہلو میں ایک اور نہر کھودی گئی ہے جس سے اصل نہر پر پڑنے والا بوجھ کم ہو جاتا ہے، بالکل اس طرح جیسے جدید میڈیکل سائنس میں مریض کا سینہ کھول کر دل کی شریانوں کے پہلو میں دوسری شریان لگا کر وہ مشہور و معروف آپریشن کیا جاتا ہے جو بائی پاس کہلاتا ہے۔

آخر میں روڑکی کی ایک اور رونق بیان کر دوں جو میں نے اپنے چھٹ پن میں دیکھی تھی۔ وہاں شاندار کالج کے لمبے چوڑے سرسبز میدان میں وہ کھیل ہوا کرتا تھا جسے چاند ماری کہا کرتے تھے۔ وہ دراصل نشانہ بازی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ کھلاڑی اپنی

بندوقوں سے نشانہ بازی کیا کرتے تھے، سخت مقابلہ ہوتا تھا اور کوئی بڑا انعام بھی ہوتا ہوگا مگر اسے دیکھنے کے لئے وہاں ایک خلقت جمع ہوتی تھی۔ پورے علاقے میں شامیانے لگے ہوتے تھے جن کی طنابوں میں الجھ کر مجھے اپنا گرنا یاد ہے۔ میں ایک کھونٹے پر اس طرح گرا کہ میرے ماتھے سے ذرا نیچے دونوں آنکھوں کے عین درمیان گہرا گھاؤ لگا۔ مجھے سائیکل پر بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ اتنا بے ڈھب گھاؤ دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئے۔ مجھے یاد ہے انہوں نے مجھے بنچ پر بٹھایا اور خود فرش پر اکڑوں بیٹھے اور بڑی مہارت سے اس گہرے کٹ کو ٹانکے لگانے لگے۔ زخم کے علاقے کو قدرت نے اتنا سن اور بے حس کر دیا تھا کہ مجھے سوئی کی چبھن تک محسوس نہیں ہوئی اور زخم چند دنوں میں بھر گیا۔ اس کا نشان باقی تھا جو میرا قد بڑھنے کے ساتھ نیچے سرکتا ہوا ایک رخسار پر آ کر ٹھہر گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ چاند ماری میں نشانہ خطا ہو گیا ورنہ تمہاری آنکھ کی خیر نہ تھی۔

میرا شہر، میرے موسم

روڑکی کو اگر کوئی دیکھے تو برسات میں دیکھے۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے کا موسم ہمالیہ سے اتر کر علاقے کی چکنی مٹی پر برستا ہے تو ہوا کی خوشبو ہی نہیں، رنگت بھی بدل جاتی ہے۔ پھر جو سبزی مائل سفید امرودوں پر پہلا چھنٹا پڑتا ہے اور شاخوں کو ہلائے بغیر جو جامن ٹپکتی ہے اس کا مزا نیچے میدانوں والے کیا جانیں۔ بارش سے پہلے جو تیز ہوائیں چلتی ہیں تو سبزی منڈی میں کچی کیریوں کی ڈھیریاں لگ جاتی ہیں۔ اُن دنوں کیری تول کر یا گن کر نہیں، ڈھیری کے حساب سے بکتی ہے۔ ساتھ ہی پنساریوں کی دکانوں سے اچار کا مصالہ سیروں کے بھاؤ پرانے اخباروں کی تھیلیوں میں بھر بھر کر فروخت ہوتا ہے۔ ہر بار منڈی والے کہتے ہیں کہ ہوا تیز تھی، اس سال آم بہت کم آئے گا۔ لیکن کچھ روز بعد ہی جب گاؤں دیہات کی جانب سے گدھوں کی پیٹھ پر لد کر آموں کے انبار آتے ہیں تو وہی منڈی والے دونوں ہاتھوں سے کمارہے ہوتے ہیں۔ میرے والد صبح تڑکے چہل قدمی کے لئے اُس راستے پر جاتے تھے جدھر سے گاؤں والے آم کی لادیاں لایا کرتے تھے۔ ابّا وہیں قیمت چکا کر آموں سے لدا ایک گدھا گھر لے آتے تھے۔

گھر کی انگنائی میں ایک چارپائی ڈال دی جاتی تھی اور کسان سارے آم اس پر انڈیل دیتا تھا۔ اتنی دیر میں آسمان سے برستی پھوہار تیز بارش کا روپ بدل کر تازہ تازہ آموں پر جی کھول کر برستی۔ ہم سارے گھر والے ابّا کا اشارہ پاتے ہی آموں پر ٹوٹ پڑتے۔ اس کارروائی کے بھی کچھ قاعدے قانون تھے۔ پہلے آم کو پلپلایا جاتا تھا، پھر اس کا ڈنٹھل توڑ کر اس کا چیپ نکالا جاتا۔ گوند جیسا یہ چیپ جلد کو لگ جائے تو دانے نکل آتے تھے۔ آخر میں پلپلائے ہوئے آم منہ میں نچوڑے جاتے تھے۔ یہ کام اُس وقت تک جاری رہتا جب تک آموں کا عرق کہنیوں سے نہ ٹپکنے لگے۔ آخر میں امّاں کی یہ ہدایت ضرور سنائی دیتی کہ لڑکو، اس کے اوپر دودھ ضرور پینا ورنہ پھوڑے نکل آئیں گے۔ اس کے بعد کیا ہوتا؟ مجھے آم کے اوپر دودھ پینا تو یاد نہیں البتہ منہ کے گرد پھوڑوں کا نکلنا کون بھول سکتا ہے۔

بارش جب بھی برستی ٹوٹ کر برستی۔ اس وقت کا نظارہ بیان کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ بارش چھاجوں برستی، پہاڑ نظر آنے بند ہو جاتے اور فضا میں دھند سی چھا جاتی۔ اس وقت بازاروں میں پھیلے ہوئے اتھلے ٹوکروں میں بھیگے ہوئے پتّوں پر قاعدے سے جمائے ہوئے شہتوت آ جاتے، کچھ ہرے، کچھ سرخ جن کے اوپر گلاب کی پنکھڑیاں ضرور پڑی ہوتیں۔ ویسا شہتوت اوپر پہاڑوں پر ہوتا ہو تو الگ بات ہے، میدانوں میں نصیب نہیں۔ اور وہی دن ہوتے ہیں جب جامن سے بھرے ٹوکرے اور اس سے بڑھ کر جامن والوں کی صدائیں بازاروں میں میلے کا سماں باندھ دیتی ہیں۔ ٹوکروں کے گرد کھڑا مجمع اپنے حصے کی جامن خریدتا جاتا ہے۔ جامن والا وہ ساری جامن مٹّی کے کلھڑ میں انڈیل کر، اس پر مصالحہ چھڑک کر اور اوپر ڈھکّن رکھ کر بڑی مہارت سے جامن بگھارتا ہے اور ڈھاک کے بڑے سے پتّے پر انڈیل کر رال

ٹپکاتے گاہک کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ ساتھ ہی کہتا جاتا ہے کہ بھائیو، اس کے اوپر پانی نہ پینا۔ شکر ہے کہ اپنا جملہ پورا نہیں کرتا کہ دیکھنا، ہیضہ ہو جائے گا۔

روڑکی کی ایک اور نعمت ہرا ملائم مہکتا سنگھاڑا ہے۔ تالابوں سے نکال کر اسی وقت بازاروں میں لے آتے ہیں۔ انگوٹھے اور انگلیوں سے چھلتا ہے تو اس سے اڑنے والی رس کی بوندیں ایسی خوش بو دیتی ہیں جو کسی اور شے میں نہیں ہوتی۔ ان ہی دنوں بازار میں بیر آتے ہیں جو دیکھنے میں سیب جیسے نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ملائم گنّا بکنے کو آتا ہے جسے بچّے بھی دانتوں سے چھیل کر چوستے ہیں اور گنڈیریوں کا پھوک ہر طرف تھوکتے پھرتے ہیں۔ بازار میں کیتھا بھی آتا ہے اور بیل بھی، دونوں کرکٹ کی گیند جیسے۔ کیتھا تو کڑوا کسیلا ہوتا ہے لیکن بیل سے سونے کی رنگت جیسے عرق ٹپکتا ہے۔ آج کے لوگ جانتے بھی نہ ہوں گے کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ میں پچھلی بار جب روڑکی گیا تو نہر کے کنارے گھوڑا گاڑیاں دیکھیں جنہیں مقامی لگ 'بگّی' کہتے ہیں۔ میں اس میں بیٹھ کر کلیر شریف جا رہا تھا کہ بارش کا چھینٹا پڑا۔ وہیں نہر کے کنارے ایک ریڑھے پر بارش میں دھلے وہی سبزی مائل سفید امرود بِک رہے تھے۔ میں نے خریدے، دونوں ہتھیلیوں میں بھینچ کر انہیں چیرا، ان پر مصالحہ چھڑکا اور کھا گیا۔ شہد جیسے تھے۔ یوں لگا کہ حضرت علاالدین صابر کی درگاہ پر حاضری کا صلہ راستے میں ہی مل گیا۔

میرا گنّا، میرا گُڑ

روڑکی کا ذکر مکمل ہو ہی نہیں سکتا جب تک گنّے اور گُڑ کی بات نہ ہو۔ اس شہر کی مٹھاس ان ہی دو چیزوں اور علاقے کے کھڑے لہجے ہی سے تو ہے۔ ہر لفظ پر

تشدید لگاتے ہیں، بلکہ یوں کہئے کہ 'لگاتے' ہیں۔لیکن اتنے امن پسند ہیں کہ مزاج میں تشدّد نام کو نہیں۔شہر کا جو منظر آج تک آنکھوں میں گھومتا ہے یہ ہے کہ گنّے سے لدی بیل گاڑیاں شہر کے اندر سے گزر رہی ہیں، ان کے پیچھے پیچھے ایک چوکی دار ہاتھ میں چھڑی لئے چل رہا ہے۔ساتھ ہی شہر کے شریر لڑکے بھی لپک رہے ہیں۔ادھر آنکھ بچی،لڑکوں نے چلتی بیل گاڑیوں سے گنّے کھینچ لئے۔پھر ان گنّوں کا گھر جانا نصیب نہیں ہوتا بلکہ وہیں رستے میں تیاپانچا ہو جاتا اور باقی کیا بچتا؟ چوسی ہوئی گنڈیریوں کا پھوک۔ادھر شہر کے چاروں طرف پھیلے ہوئے گاؤں دیہات میں جفاکش بیل گنّے پیلنے پر لگا دیئے جاتے۔بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھ جاتے اور بالٹیاں بھر بھر کر گنّے کا رس ذرا اونچائی سے انڈیلا جاتا۔پھر رس کے اوپر بننے والے بلبلے آگ کی حرارت پاکر پھوٹتے اور فضا میں جو سوندھی مہک پھیلتی، شہر والے اس کا لطف کیا جانیں۔ہاں، بعض شہر والے بائیسکلوں پر بیٹھ کر دیہات کی طرف نکل جاتے جہاں گُڑ پکانے والے کسان ان کی خاطر مدارات کرتے یعنی انہیں گرم گرم گُڑ پیش کرتے۔ایسی مٹھاس تو کہیں دنیا کے پرلے پار ملے تو ملے، کہیں اور ملنے کی نہیں۔گاؤں والے ایک کمال اور کرتے ہیں، وہ رساول پکاتے ہیں، یعنی رس اور چاول۔یہ مٹّی کی ہانڈیوں میں پکتا ہے۔اس میں کشمش اور کترا ہوا ناریل پڑتا ہے۔رساول تیار ہو جائے تو ہانڈی کے منہ پر کپڑا باندھ کر اسے رات کی اوس میں رکھ دیتے ہیں۔پھر یہ مہکتا ہوا، سوندھا اور سلونا رساول تحفے میں چاروں جانب بھیجا جاتا ہے۔اسی طرح گڑ اور کیری سے بہترین گڑمبا بنتا ہے جس میں بھُنی ہوئی سوجی کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ہم گاؤں کے دانے دار اصلی گھی کے اوپر وہ ملائم گڑ چھڑک کر جو اندر کی کہلاتا ہے، بہت گرم چپاتی سے کھایا کرتے تھے، وہ بھی دھوپ میں بیٹھ کر۔اسی دوران گھر میں گڑ پٹّی بنتی تھی۔

پگھلے ہوئے گڑ میں خشک میوے ملا کر اور اسے پھیلا کر ٹھنڈا کر لیا جاتا تھا۔ مالدار لوگ اس میں کھویا، بالائی اور خدا جانے کون کون سی نعمتیں ملاتے تھے۔ ہمارے گھر میں پگھلے ہوئے ملائم گڑ کی لمبی چھڑیاں بنائی جاتی تھیں۔ جب وہ ٹھنڈی ہو جاتیں تو انہیں کھٹ کھٹ کاٹ کر اور تلوں میں لتھیڑ کے وہ شے بنائی جاتی جسے عام لوگ ریوڑی کہا کرتے ہیں لیکن جو ہمارے گھر میں کھٹیا کہلاتی تھی۔ اس میں گلاب کی مہک ہوتی تھی اور منہ میں اصلی گھی کے گھونٹ آتے تھے۔ اور آخر میں گڑ سے حاصل ہونے والی سب سے بڑی نعمت: گزک۔ لوگ شکر سے بھی بناتے ہیں لیکن گڑ اور تلوں کو ملا کر مسلسل کوٹا جاتا ہے جس کے نتیجے میں خستہ گزک بنتی ہے، کبھی پیڑے کی شکل میں اور کبھی چپٹی جمائی ہوئی۔ مجھے یاد ہے میری کمسنی میں شہر خورجے کی گزک بہت ہی لذیذ ہوا کرتی تھی۔ اتنی کم وزن اور ہلکی کہ پھیلی ہوئی ہتھیلی پر آہستہ سے رکھیں تو محسوس نہ ہو۔ اور اس کی شہرت بھی بہت تھی۔ اب گزک بنانے والے کاریگر نقل وطن کر کے پاکستان چلے گئے ہیں اور زمانہ دیکھے ہوئے ہمارے بڑے بوڑھے بھی کہیں ہیں کہ بہترین، خستہ اور سوندھی گزک اب پاکستان میں ملے ہے، کبھی گزک کے بازار میں جائیو تو یہ دیکھ کے کہ جس دکان میں کوئی بزرگ دکان دار بیٹھے ہوں، ان سے گزک خریدیو، وہی پرانے انداز والی، اور ہاں، میرا اسلام ضرور کہئیو۔ وہ تھوڑی سی گزک اوپر سے بھی دے دیں گے۔

میری دوپہریں

خدا یہ شہر سب کو دکھائے، اس کی گرمیاں کسی کو نہ دکھائے سامنے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی ہیں مگر روڑکی میں آگ برستی ہے۔ یہ پورا علاقہ دہکتا ہے

اور پھکتا ہے۔ اور دوپہر کا ہوتا تو غضب ہے۔ ایسی تمازت ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ مگر انسان بھی کسی عجوبے سے کم نہیں۔ وہ سوا نیزے پر اترے ہوئے سورج کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اب آپ میرے ساتھ میرے گھر میں آیئے۔ تربوز آ گئے ہیں، خربوزے برف میں لگا دیئے گئے ہیں۔ فالسے کا شربت نہیں بن سکا تو کوئی بات نہیں، بھوبھل میں دبائی ہوئی کیری کا شربت بنے گا۔ گرمی کا زور توڑنے کے لئے شربت میں تخم بالنگا ڈالا جائے گا۔ اور اگر سب گھر میں موجود ہیں اور موسم کو شکست دینے کے ارادے ہیں تو سمجھئے قلفی جمانے کا دن ہے۔ وہی جسے ہمارے بزرگ قفلی کہا کرتے تھے۔ اس کے مخروطی نوکیلے سانچے دھل گئے ہے۔ ان میں کاڑھا ہوا دودھ اور پستے بادام کے ٹکڑے ڈال دیئے گئے ہیں۔ آخر سانچوں پر ڈھکن لگا کر ان کے کناروں پر آٹا لگا کر اچھی طرح بند کر دیا گیا ہے۔ ایک بڑے سے مٹکے میں برف کے ٹکڑے بھر کر اور ان میں قلفی کے سانچے ڈال کر مٹکا لڑکوں کے حوالے کر دیا گیا ہے کہ اس کو دیر تک ہلائیں جُلائیں یہاں تک کہ سانچوں میں دودھ جمنے لگے۔ آخر اعلان ہوا کہ قلفی تیار ہے۔ اب سارا گھر چاقو سے سانچوں کے منہ پر لگا آٹا کھرچ کر انہیں کھولے اور تپتے ہوئے موسم کو شکست دے۔

اور کچھ دن ایسے بھی آتے تھے کہ لو چلتی تھی اور گرم ہوا میں سانس لیتے ہوئے دم گھٹتا تھا۔ اس روز گھر کی بالائی منزل کو چھوڑ کر سب نچلی منزل کے اس کمرے میں منتقل ہو جاتے جس میں اندھیرا کر دیا جاتا تھا، اس کے بڑے دروازے پر خس کی ٹٹی ڈال دی جاتی تھی۔ گھر کا ملازم اس پر پانی چھڑکتا رہتا اور چھت کے پنکھے کی ڈوری کھینچتا رہتا۔ فرش پر سیتل پاٹی بچھا دی جاتی جسے پانی کا ہلکا سا چھنٹا دے کر ذرا سا تر کر دیا جاتا۔ جب کمرہ ٹھنڈا ہو جاتا تو سارا کنبہ چین سے سو جاتا۔ اور اس وقت تک سوتا جب

تک تربوز کٹنے کی خبر عام نہ ہوتی۔ سولانی ندی کی ریت میں پکا ہوا تربوز اتنا تیار کہ گہرا سبز ہو مگر دیکھنے میں سیاہ لگے۔ تربوز کٹے تو اس کے ٹکڑے کرنے کے دوران میں اتنا رس نکلے کہ ایک بڑا جگ بھر جائے۔ تربوز کا شربت دیتے وقت ابّا کا حکم: پنکھا جھلنے والے لڑکے کو بھی پلایا جائے۔ باجی کو پسینے میں نہائے ہوئے اس لڑکے پر پیار آئے تو شربت میں برف کے ذرا زیادہ ٹکڑے ڈال دیئے جائیں۔ جوان لڑکے جو گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں انہیں ہزار جتن کر کے جگایا جائے ورنہ خبردار کر دیا جائے کہ تربوز ختم ہو جائے تو پھر احتجاج نہ کریں، شور نہ مچائیں۔

اتنے میں کسی کو خیال آئے کہ چھوٹا والا غائب ہے۔ یہیں تو لیٹا تھا اس کونے میں۔ کہاں گیا، کدھر گیا۔ آخر پنکھا جھلنے والا لڑکا بولے۔ ''اس کے دوستوں نے باہر کھمبا بجایا تھا، وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

سچ ہے بڑی گرمی کو اسی چھوٹے نے شکست دی۔

میرے جاڑے

جھلسا دینے والی گرمی کے بعد جب (ہمارے) دانت بجاتی ہوئی سردیاں آتیں تو یقین نہ آتا کہ یہ وہی شہر ہے۔ پہاڑوں سے لگا لگا شہر یوں نظر آتا جیسے سکڑ گیا ہو۔ سویرے جب لوگ کام پر جا رہے ہوتے، فضا میں کہرا ہوتا، دھوپ پھیکی پڑ جاتی، لوگوں کی سانسوں میں بھاپ کے بادل اڑ رہے ہوتے اور سائیکل سوار تیز تیز بائیسکل چلاتے تاکہ جسم گرم رہے۔ بس، وہی ہمارا اسکول جانے کا وقت ہوتا۔

ہمیں روئی کے موٹے استر والی بنڈیاں یا گرم کوٹ پہنائے جاتے (جن کی آستینیں بہتی ہوئی ناک پوچھنے کے کام آتیں)۔ سر پر موٹے اونی کنٹوپ پہنائے

جاتے۔ان ہی دنوں روئی دھننے کے لئے دھنیا آتا اور پرانے لحاف کھول کر ان کی روئی دھن کر دوبارہ بھری جاتی۔ وہ دوپہروں کا کھانا دھوپ میں بیٹھ کر کھانا خوب یاد ہے۔عموماً گرم مٹر پلاؤ یا کھچڑی پکتی تھی۔کبھی کبھی سری پائے پکائے جاتے جن کے ساتھ خمیری روٹی ہوتی تھی۔ دو چار بار شب دیگ کا کھایا جانا بھی یاد ہے۔سخت جاڑے میں خاص طور پر بچّوں کے لئے گوشت کی یخنی پکتی تھی۔مگر جو خاص سردیوں کا تحفہ تھا وہ ابّا کی فرمائش پر جاڑوں کے حلوے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ گیہوں بھگوئے جاتے تھے جن سے انکھوے پھوٹتے تھے۔ان کو سکھا کر باریک آٹا پیسا جاتا تھا۔اس وقت نشاستہ کا لفظ سننے میں آتا تھا جس سے حلوہ سوہن بنتا تھا جسے پھیلا کر چاقو سے 'جوزیں' کاٹی جاتی تھیں اور وہ حلوہ سوہن جوزی کہلاتا تھا۔اسی طرح کا جو حلوہ سخت ہوتا تھا اسے حلوہ سوہن پپڑی کہا جاتا تھا۔ابّا کے لئے انڈے کی زردی کا حلوہ بنا کرتا تھا جو نمعلوم کیوں ہم لڑکوں کو نہیں دیا جاتا تھا البتہ حلوہ سوہن اور انڈے کی سفیدی کا حلوہ سب لڑکوں کو دے دیا جاتا تھا اور ان پر چھوڑ دیا جاتا تھا کہ تھوڑا تھوڑا روز کھائیں اور کئی دن چلائیں یا پھر جب جی چاہے ہڑپ کر جائیں۔ اکثر ہڑپ ہی ہوتا تھا۔ صرف ہونٹوں پر لگے رہ جانے والے چاندی کے ورق سے بھید کھل جاتا تھا کہ میر صاحب حلوہ خور ہو گئے ہیں۔

جیسے آج سننے میں آتا ہے کہ دنیا کا موسم گرم ہوتا جا رہا ہے، اُن دنوں بھی کچھ ایسی ہی بات مشہور تھی۔ابّا بتاتے تھے کہ جن دنوں وہ صبح سویرے سائیکل پر بیٹھ کر کالج جاتے تھے، راستے میں ہوا میں برف کے ریشے ہوا کرتے تھے جو کپڑوں پر چپک جاتے تھے۔میرے ہوش سنبھالنے تک برف تو نہیں البتہ سردیوں میں اولے گرا کرتے تھے۔ ایک سال انڈوں کے برابر اولے گرے جن سے اڑتے ہوئے

پرندے مر گئے تھے اور اولے دو تین دن تک جمے رہے تھے۔ میں نے ان دنوں زندگی میں پہلی بار اپنی ڈائری لکھنی شروع کی تھی جسے کھول کر ژالہ باری کی تاریخ دیکھا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے اس ڈائری میں اپنے دس پسندیدہ گانوں کے بول لکھے تھے۔ وہ بول تو یاد نہیں البتہ ان میں فلم دوست کا نور جہاں کا ایک گانا شامل تھا: ستم پر ستم، الم پر الم ہم اٹھائے ہوئے ہیں۔ اب سنتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ موسیقار سجّاد کی بنائی ہوئی اتنی مشکل طرز کی کون سے بات مجھ کو بھائی تھی اس نوعمری میں۔

جاڑے مجھے کبھی اچھے نہیں لگے۔ جلد خشک ہو کر پھٹ جاتی تھی اور ناک اتنی کثرت سے بہا کرتی تھی کہ، سچ پوچھئے تو یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اپنے بچوں کے بچوں کو بتاتا ہوں تو وہ ہنستے ہیں۔ اسی طرح سارا شہر کھانسا کرتا تھا۔ نہر کا پانی اتنا ٹھنڈا ہو جاتا تھا کہ لڑکے ادھر کا رخ ہی نہیں کرتے البتہ وہ چنے کے کھیتوں میں گھس کر پورے پورے پودے توڑ لاتے تھے جن میں ہرے چنے لگے ہوتے تھے، ان کو لڑکے آگ پر بھون کے کھایا کرتے تھے جن سے منہ کالے ہو جاتے تھے۔ اس پر یاد آیا کہ ان دنوں ٹڈّی دل باقاعدگی سے آتے تھے۔ غول کے غول خدا جانے کہاں سے اٹھتے تھے اور راستے میں لگی ہریالی کو چٹ کرتے ہوئے کہاں تک جاتے تھے۔ لڑکے گرنے والی ٹڈّیوں کو اٹھا کر ان کا پیٹ یا شاید کوئی اور حصہ بھون کر کھایا کرتے تھے۔

لڑکوں کا ایک اور پسندیدہ مشغلہ رات کے وقت جگنو گرانا تھا۔ فضا میں اڑتے جگنو دیکھ وہ زور زور سے تالیاں بجاتے تھے جن کی دھمک سے بے چارے جگنو چکرا کر گر جاتے تھے۔ لڑکے ان کو کسی شیشی میں یا اپنے کرتے کے دامن میں بند کر لیا کرتے تھے۔ میں ۳۵ سال بعد روڑکی گیا اور اپنے کمسنی کے دوست فیض محمد کے ہاں ٹھہرا۔ رات کے وقت اس کے بچے میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور مجھ سے بچپن کی

باتیں سننے کے لئے۔ ان بے چاروں نے نہ کبھی جگنو دیکھے تھے نہ ان کے گرائے جانے کا قصہ سنا تھا۔ اس پر میں نے بچوں سے کہا کہ تم نے بارش کے بعد گھاس سے نکلنے والی بیر بہوٹی بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سچ ہے، دنیا کا موسم گرم ہو یا نہ ہو، بدل رہا ہے ضرور۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ رات کے سنّاٹے میں شہر والوں کو اب نہر کے پانی کے تھپیڑے بھی سنائی نہیں دیتے۔ کتنا بڑا خسارہ ہوگیا ہے۔

روڑکی دوبارہ جانے اور سنہ ۴۴ کے دوست فیض محمد کی بات چھڑی تو ذہن کے کون کون سے گوشوں میں یادوں کے چراغ جلے۔ یہاں سے آگے ان ہی کا ذکر ہے۔

میری انگنائی، میرا کوٹھا

روڑکی کی گرمی کے دنوں کی بات ہوچکی، اب راتوں کی بات سنئے وہاں سارا شہر کمروں میں نہیں بلکہ کھلی جگہوں میں سوتا تھا۔ تصور کیجئے کہ گھنی رات ہے اور پورے شہر کی آبادی چھتوں پر سو رہی ہے۔ ہمارے گھر کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ سب سے نیچے ابّا کی دکان اور آرام کا کمرہ تھا۔ اوپر کی منزل پر تین طرف پورے کنبے کے رہنے کے کمرے تھے جن کے درمیان وہ کھلی ہوئی جگہ تھی جسے ہمارے ہاں انگنائی کہا جاتا تھا۔ سب سے اوپر والا حصہ کوٹھا کہلاتا تھا، چھت نہیں۔ چھت پڑوسیوں کی تھی جس کے گرد کوئی منڈیر نہیں تھی اور نہ ہی بارش سے بچنے کا کوئی بندوبست تھا۔ وہ لوگ نیچے آنگن میں سوتے تھے۔ ہمارا کوٹھا گویا تیسری منزل تھی، بہت کشادہ اور پُر فضا۔ ایک جانب ٹین کی چھت والا بڑا سا سائبان تھا۔ اس کا ہونا ضروری تھا کیونکہ روڑکی کی بارشوں

کا کوئی دین دھرم نہیں تھا، جب جی چاہا برس گئیں۔اب سوچیئے ہر طرف بچھونے بچھے ہیں اور سارا کنبہ سو رہا ہے کہ اچانک پہلے موٹی موٹی بوندیں گریں اور فوراً ہی پلنگ گھسیٹنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔اور اگلے ہی لمحے سارے کے سارے دوبارہ نیند میں محو ہو گئے۔

اسی کوٹھے پر ہم رات کو جگنو دیکھتے تھے، یہیں سے دور دہرہ دون کے پہاڑی جنگلوں میں لگنے والی آگ نظر آتی تھی۔اور سب سے بڑھ کر یہیں عید کا چاند دیکھا جاتا تھا۔کیسی عجیب بات ہے، ان دنوں عید کا چاند ضرور نظر آتا تھا، نہ کوئی دوربین، نہ کسی کی شہادت اور نہ فتویٰ۔البتہ ایک سال مجھے یاد رہے گا جب لاکھ کوششوں کے باوجود چاند نظر نہیں آیا۔سبھی، خاص طور پر بچے بہت مایوس ہوئے اور اگلے روزے کی تیاری کر کے سو گئے۔پھر یہ ہوا کہ دوپہر ٹھیک بارہ بجے جب سورج اپنے عروج پر تھا، بیچ آسمان نیا چاند نظر آنے لگا۔لوگوں نے جلدی جلدی روزہ توڑا اور عید گاہ کی طرف لپکے۔روڑکی میں عید کا وہ منظر بہت دل چسپ ہوتا تھا جب نیم دیہاتی قسم کے لوگ عید گاہ جانے کے لئے نیا نیا خریدا ہوا جوتا پہن کر نکلتے تھے جو پیروں کو بُری طرح کاٹتا تھا چنانچہ بیسیوں نمازی لنگڑا رہے ہوتے۔

نوعمری کے دوستوں کی بات سے پہلے سوچتا ہوں ابھی چھڑنے والی کہانی آگے بڑھائی جائے۔روڑکی کے محلّہ بی ٹی گنج میں ہمارے گھر سے ملے ہوئے گھر کی کہانی۔

ان کا نام رتن تھا، شہر کی کچہری سے وابستہ تھے، شاید قانون گو تھے۔ان کی بیوی بہت بھاری بھرکم تھیں۔ہم سب انہیں بھابھی کہتے تھے ان کے دو بیٹے تھے، رامے جوان تھا اور میرے بڑے بھائیوں کا دوست تھا۔چھوٹے کا نام بلّی تھا، وہ میرا

ہم عمر تھا اور سارا دن ساتھ کھیلنے والا دوست تھا۔ ان کی ایک بیٹی رجّو تھی۔ وہ جوان تھی اور محلے کے لڑکے اسے تاڑا کرتے تھے۔ اس کا بھی کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے۔ وہ سب سبزی خور تھے اور ان کی رسوئی میں بھاجی پکتی اور پھلکوں پر اصلی گھی میں ڈوبا ہوا چمچ پھیرا جاتا تو اس کی خوش بو سے ہم لوگوں کی بھوک کھل جاتی تھی۔ اسی طرح ہمارے ہاں کباب تلے جاتے تو رامے ایک سازش کرتا۔ میرے بھائیوں سے فرمائش کر کے ایک کباب کھاتا اور کہتا جاتا کہ میرے گھر والوں کو نہ بتانا۔ لیکن اس گھر کی کہانی کا سب سے پُراسرار کردار کوئی اور نہیں، رجو تھی۔

اس کی شادی کی عمر تھی۔ ایک بار لڑکے والے اسے دیکھنے آئے تھے۔ ہندو روایت کے مطابق رجو نے گانا سنایا اور ناچ کر دکھایا۔ اس کے بعد شادی تو نہیں ہوئی لیکن ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ رجو تمام دوسری عورتوں کی طرح صبح سویرے اشنان کرنے نہر پر عورتوں کی گھاٹ پر جایا کرتی تھی۔ وہاں کا راستہ کمپنی باغ سے گزر کر جاتا تھا جہاں انگریزوں کے لگائے ہوئے درخت بہت بڑے اور گھنے ہو چکے تھے۔ ایک کٹھل کا درخت تھا جس پر لگنے والا کٹھل کم سے کم پانچ پانچ سیر کا ہوتا ہوگا مگر اتنا اونچا ہوتا تھا کہ نیچے سے چھوٹا نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی لوگ درخت پر چڑھتے اور وہ وزنی کٹھل رسّی سے باندھ کر نیچے اتارتے، کیونکہ اگر اوپر سے گراتے تو وہ گرتے ہی پاش پاش ہو جاتا۔ باغ میں اس سے بھی بڑا ایک اور درخت تھا جو شاید جامن کا تھا۔ اس کے بارے میں عام خیال تھا کہ اس پر جنّات کا بسیرا تھا۔ بس، گھاٹ پر جاتے ہوئے رجو اس درخت کے نیچے سے گزرتی تھی۔ کم سے کم تین بار تو مجھے یاد ہے کہ اس کے سر پر جنّات آ گئے۔ محلے میں اس خبر کا وہی عالم ہوتا کہ ہونٹوں چڑھی کوٹھوں چڑھی۔ رجو کے سر پر جن آتا تو لڑکی کے دیکھنے کا انداز خطرناک ہو جاتا، اس کی آنکھوں میں خون

اتر آتا اور اس پر دورے پڑنے لگتے۔ لوگ دوڑائے جاتے جو شہر سے لگے لگے ایک گاؤں سے مولوی صاحب کو بلا کر لاتے اور پھر جو منظر ہوتا، اس کو دیکھنے کے لئے ہم لوگ کوٹھے پر چڑھ جاتے جہاں سے رجو کے گھر کا پورا دالان نظر آتا تھا۔ وہیں اس کے سر سے جن اتارنے کا عمل ہوتا۔ رجو کو فرش پر بٹھایا جاتا اور اس کے قریب دہکتی ہوئی انگیٹھی رکھی جاتی وہیں مولوی صاحب بھی بیٹھتے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے۔ اس پر رجو خوں خوار مردانہ آوازیں نکالتی۔ یوں لگتا کوئی مولوی صاحب کو ڈرا رہا ہے۔ اب مولوی صاحب دہکتے ہوئے کوئلوں پر مرچیں یا ایسی ہی کوئی شے ڈالتے اور رجو کی ناک میں دھونی دیتے اس کے ساتھ ہی جن کے ساتھ ان کے مکالمے شروع ہوجاتے۔ 'تو کون ہے، کہاں سے آیا، لڑکی کے سر کیسے چڑھا۔ تیرا نام کیا ہے، نام بتا اپنا؟' بس یہ عجیب بات ہوتی۔ جن کا نام کبھی عبدالرحمان ہوتا، کبھی عبدالرحیم اور کبھی ایس ہی کوئی مسلمانوں والا نام۔ آخر رجو کے منہ پر خالی ہانڈی رکھ کر جن کو حکم دیا جاتا۔ 'ہانڈی میں اُتر'۔ جن مسلسل انکار کرتا جس پر ناک میں اور دھونی دی جاتی۔ بڑی مشکل سے جن رجو کے سر سے اتر کر ہانڈی میں چلا جاتا جسے جلدی سے بند کر کے اور اوپر ڈھکن رکھ کر ہانڈی کا منہ اچھی طرح بند کر دیا جاتا۔ اس دوران رجو کا سارا وجود پسینہ پسینہ ہوجاتا اور جن اترتے ہی وہ نڈھال ہو کر رہ جاتی۔ بالآخر مولوی صاحب کو کچھ دے دلا کر رخصت کیا جاتا اور ہمیں اماں کی ڈانٹ سننے کو ملتی کہ نیچے آؤ اور سو جاؤ ،صبح اسکول جانا ہے۔

رجو سے میرا ایک کام نکلتا تھا۔ میری کمر میں چک آجاتی تھی۔ (کمبخت اب بھی آتی ہے)۔ عقیدہ یہ تھا کہ اگر کوئی بن بیاہی لڑکی کمر پر پانچ یا شاید سات مرتبہ (آہستہ آہستہ) لات مارے تو کمر کی چک نکل جاتی ہے۔ مجھے وہ لاتیں کھانا تو یاد ہے

لیکن چک کوئی جن نہیں تھی کہ پیچھا چھوڑے اور ہانڈی میں اتر جائے۔اسی طرح میری آنکھ میں گوہانی نکلا کرتی تھی، پپوٹے پر چھوٹی سی پھنسی۔اس سے نجات پانے کا ٹوٹکا بڑا ہی احمقانہ تھا۔یعنی صبح تڑکے جیسے ہی سورج طلوع ہو، اسے منہ چڑایا جائے، گوہانی ٹھیک ہو جاتی تھی۔اس میں کمال ٹیڑھے بکڑے منہ کا نہیں، شاید صبح کی پہلی کرنوں کا تھا۔اب یہ سوچ کر ہنسی آتی ہے کہ بچّے کھڑے سورج کا منہ چڑا رہے ہیں اور ان کی آنکھوں کی تکلیف دور ہو رہی ہے۔

پھر سوچتا ہوں یہ بھی کوئی یاد رکھنے کی باتیں ہیں؟

میری گلی، میرا دروازہ

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ لکھنؤ پر بُرا وقت پڑا۔ ابا نے اپنا شہر چھوڑ دیا۔ اور ایسا چھوڑا کہ انہوں نے اپنے ٹھکانوں کی فہرست سے لکھنؤ کا نام کاٹ دیا۔ وہ پچاس سال تک لکھنؤ نہیں گئے۔ البتہ صرف ایک بار ایک بیٹے کی شادی کرنے لکھنؤ گئے، میں ان کے ساتھ تھا۔ وہاں ایک روز مجھ سے بولے کہ آؤ تمہیں چوک کی سیر کرائیں۔ سیدھی مانگ کی طرح چلے جانے والے اس بازار کی بہاریں کبھی کی لُٹ چکی تھیں۔ ابا ایک بوڑھے پنواڑی کی دکان پر پہنچے۔ پنواڑی ابا کا ہم عمر رہا ہوگا جس کی بینائی اب جانے کو تھی۔ اس کے قریب جا کر بولے۔ ''پہچانا؟۔ ہم پیارے صاحب ہیں''۔ اور جس وقت حیرت زدہ پنواڑی دکان سے اتر کر ابا سے لپٹ کر رو رہا تھا اُس وقت مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ابا کا نام پیارے صاحب بھی تھا۔ کراچی کے حیدری باغ قبرستان کی ایک پرانی قبر پر یہ نام اب تک لکھا ہے۔ بس پھر میرا اکبر علی نے شہر روڑ کی آباد کیا اور جیسی ہونہار اولادیں اٹھائیں اس کا بیان ان ہی صفحوں میں کہیں ملے گا۔

جس وقت میں نے ہوش سنبھالا دوسری عالمی جنگ زوروں پر تھی۔ کسانوں

کی ساری پیداوار محاذوں پر جارہی تھی، لوگوں کے پاس پیسہ آ رہا تھا اور کاروبار چمک رہا تھا۔ کھانے پینے کی شدید قلّت تھی۔ چائے کی پتی ملنی بند ہوگئی اور پہلی بار وہ چائے دیکھی جو چورا چائے کہلاتی تھی۔ بسیں اور لاریاں کوئلے سے چلنے لگی تھیں، بجلی کے پنکھے مٹی کے تیل سے چلنے لگے تھے۔ شکر ناپید ہوگئی تھی، اس کی جگہ وہ میلی سی چینی ملتی تھی اسے کھانڈ کہتے تھے، انڈے ملنے بند ہوگئے، ان کی جگہ انڈوں کا خشک پاؤڈر ملنے لگا۔ دودھ بھی سفوف کی شکل میں آنے لگا۔ ہندوستان پر حملے کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سول ڈیفنس یا شہری دفاع کی تیاریاں زور پکڑ گئیں۔ شہر میں جگہ جگہ خندقیں کھودی گئیں اور لوگوں کی تربیت شروع ہوگئی۔ جوں ہی سائرن بجتا ہر ایک کو لپک کر قریبی خندق میں بیٹھنا ہوتا۔ میونسپلٹی کی عمارت پر اونچا مینار بنا کر اس کے اوپر سائرن لگا دیا گیا۔ شہری دفاع کے رضا کاروں کو سکھایا جانے لگا کہ اگر بم کا گولا گرے اور پھٹنے نہ پائے تو اس کے گرد پانی چھڑک کر اسے کیسے ٹھنڈا کیا جائے۔ میرے جیسے چھوٹے لڑکے گلیوں میں گاتے پھرتے تھے ''بھرتی ہو جا فوج میں، جب گرے کا بم کا گولا کود پڑیو ہوج (حوض) میں''۔ ان دنوں ایک گانا بہت مقبول ہو رہا تھا۔ ''اب اڑوسن پڑوسن چاہے جو کہے، میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے''۔ گھر میں کام کے لئے آنے والی عورتیں بتایا کرتی تھیں کہ ان کے گھروں کے مرد 'لام' پر گئے ہوئے ہیں۔ ہم اس وقت بھی سمجھتے تھے اور آج تک سمجھتے ہیں کہ 'لام سے لڑائی'۔ سنیما میں فلم کے ساتھ نیوز ریل ضرور دکھائی جاتی تھی۔ اس میں دنیا کے مختلف محاذوں کی خبریں ہوتی تھیں۔ ان ہی دنوں ان کی کمنٹری کا یہ جملہ مشہور ہوا تھا کہ اتحادی فوجیں نہایت دلیری سے لڑتے ہوئے پسپا ہوگئی ہیں۔ ابّا کی دکان ہی ریڈیو کی تھی۔ وہ پائی کے بہت عمدہ ریڈیو پر دنیا بھر کی خبریں سنا کرتے تھے اور رات کو سونے سے پہلے امّاں کو جنگ کی

خبریں تفصیل سے سنایا کرتے تھے۔ امّاں بڑی سعادت مندی سے ہوں ہوں کیے جاتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ریڈیو ایران، استنبول اور برلن سے اردو میں خبریں آیا کرتی تھیں۔ صاف آواز سننے کے لئے ہماری چھت پر بہت بڑا تکونا ایریل لگایا گیا تھا تاکہ ہر جانب سے آنے والی ریڈیائی لہر بچ کر نکلنے نہ پائے۔ ایک رات غضب کی گرج چمک ہوئی۔ ہمارے ایریل پر بجلی گری جو تار میں سے گزرتی ہوئی پائی کے شاندار ریڈیو میں داخل ہوئی۔ ہمارا دو سو روپے کا ریڈیو دو پائی کا بھی نہ رہا۔ ادھر شہری دفاع کا نظام زوروں پر تھا۔ ہر بائیسکل کے پچھلے مڈگارڈ پر سفید رنگ کرنا لازمی تھا تاکہ وہ اندھیرے میں نظر آتی رہے۔ شہری دفاع کے رضا کار فرسٹ ایڈ کے تھیلے اٹھائے بھاگتے دوڑتے نظر آتے تھے۔ ایسے میں میرے بھائی انگلی پکڑ کر مجھے شہر کے پرائمری اسکول لے گئے اور میرا داخلہ کرا دیا۔ جب میں پہلے روز اسکول جانے لگا تو بہنوں نے مجھے سمجھایا۔ ''اسکول میں اپنا نام رضّو نہ بتانا بلکہ کوئی پوچھے تو کہنا، میرا نام رضا علی ہے'' پھر بہنوں نے پوچھا ''کیا نام بتاؤ گے'' ایک بھولی سی آواز میں جواب ملا۔ رزالی۔

اسکول میں سارے ہی لڑکے لمبی سی دری پر بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ میں بھی دری پر بیٹھ کر پڑھنے والا پیارے صاحب کا پانچواں بیٹا تھا۔

☆

میرا شہر اور کسی کو ہو نہ ہو، مجھے بہت پسند تھا۔ جب میں چھوٹا تھا، شہر کی ہر شے بڑی لگتی تھی۔ نہر بہت چوڑی، پُل بہت اونچا اور چوک گھر سے بہت دور لگتا تھا۔ جب بانس کو گھوڑا بنا کر اس کی سواری کرنے اور ڈوری لپیٹ کر لٹّو گھمانے کے دن گزر گئے تو روڑکی کی رونق میں جی لگنے لگا۔ ہمارا شہر ریل گاڑی کی بڑی گزرگاہ پر تھا۔ ہر سودے والا، پھیری والا اور سب سے بڑھ کر مجمع لگانے والا ہمارے اسٹیشن پر اتر

جاتا، میں نے خدا جانے کتنے مجمع لگانے والوں کی تقریریں سنیں، کتنوں کا تماشا دیکھا، کتنے سودے والوں کا سودا دیکھ کر للچایا کیا اور کتنی ہی چڑیوں کو اپنی چونچ سے قسمت کا حال بتانے والے لفافے نکالتے اور ہر بار لفافہ نکالنے کے صلے میں بھیگی ہوئی دال کے دانے کھاتے دیکھا۔ بے شمار مداری دیکھے، ان گنت جادوگروں کے کرتب دیکھے، بہروپیے اور مسخرے دیکھے۔ سرکس کے جلوس اور زندہ ناچ گانے والوں کے سجے دھجے تانگے دیکھے۔ اور جب کبھی شہر میں کوئی تھیٹر کمپنی آجاتی اور پورے کمپنی باغ پر قبضہ کر لیتی تو میں چھپ چھپ کر اداکاروں کو دیکھتا۔ بڑے بھائیوں کے ساتھ میں نے کتنے ہی ڈرامے دیکھے، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور عالم آرا عرف قتل تمیزن کے کئی سین مجھے یاد ہو گئے تھے۔ فرہاد جس طرح اپنے ہی تیشے سے اپنا سر پھوڑ کر مرتا تھا وہ سین کمال کا ہوتا تھا۔ لوگوں نے اسی کا لطیفہ بنا لیا تھا کہ مجمع نے ونس مور کا نعرہ لگایا۔ اس وقت یہ لطیفہ تھوڑا تھوڑا سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اور شہر میں آنے والے سرکس کی تو بات ہی اور تھی۔ اس کا ڈیرہ بھی ہمارے کمپنی باغ میں لگتا تھا، میں صبح ہی پہنچ جاتا اور کرتب دکھانے والوں سے پوچھتا کہ وہ کبھی اونچائی سے گر کر مرے تو نہیں اور شیر کو سدھانے والوں سے سوال پوچھتا کہ اگر شیر تمہیں کھا جائے تو کیا ہوگا؟ اسی شان سے زندہ ناچ گانے والوں کے طائفے شہر میں آتے۔ ان کے شو شہر کے سینما گھر میں ہوتے۔ ایک مجمع انہیں سننے اور دیکھنے کے لئے آتا۔ ان میں کچھ مشہور لوگ بھی ہوتے مگر میں ان سے واقف نہیں تھا۔ ایک زہرہ بائی انبالے والی کو جانتا تھا دوسرے تھیٹر کے مشہور اداکار ماسٹر نثار کے نام سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ ڈراما لیلیٰ مجنوں میں بے مثال کردار ادا کرتے تھے۔ ایک بار وہ روڑکی آئے اور اپنا ڈراما پیش کیا۔ ڈرامے کے ایک منظر میں انہیں اپنی قمیص کا دامن چاک کرنا تھا۔ تھیٹر کا ایک ملازم ابّا کے پاس

آیا اور کہا کہ 'میر صاحب اپنی کوئی پرانی اور بیکار قمیص دے دیجئے'۔ ماسٹر نثار ایک منظر میں اس کا گریبان چاک کریں گے۔ ابّا نے امّاں سے کہا کہ کوئی پرانی قمیص دے دو۔ امّاں کو جو بوسیدہ قمیص نظر آئی وہ دے دی۔ شام کو ہم سب ڈراما دیکھنے گئے۔ بڑے انتظار کے بعد قمیص پھاڑنے کا منظر آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ماسٹر صاحب کسی اور شخص کا گریبان چاک کر رہے ہیں۔ اگلے روز انہیں شہر کے بڑے بازار میں دیکھا جہاں وہ ابّا کی وہی قمیص پہنے گھوم رہے تھے جو ہماری امّاں کی دانست میں بوسیدہ تھی۔

روڑکی کے اس بڑے بازار میں سودے والوں کی یلغار ہوتی تھی۔ کچھ تو وہیں ڈیرہ جما کر ہر روز بیٹھا کرتے تھے، ایک منٹ میں فوٹو اتارنے والا فوٹو گرافر جو اسٹینڈ پر کھڑے ڈبہ نما کیمرے کی سیاہ آستین میں ہاتھ ڈال کر کیمرے کے اندر کچھ کاریگری کیا کرتا اور تھوڑی دیر بعد گاہک کے ہاتھ میں اس کی تصویر تھما دیتا جس میں وہ بڑی چابک دستی سے گاہک کی رنگت گوری کر دیتا۔ اسی طرح صرف دو انگلیوں سے دکھتا ہوا دانت نکالنے، نیا دانت لگانے اور دانت پر سنہری خول چڑھانے والا دندان ساز بیٹھا کرتا تھا جس کے سامنے اب تک نکالے جانے والے دانتوں کی ڈھیری اس کی مہارت کا ثبوت ہوا کرتی تھی۔ وہیں جلد پر پھول پتّی گودنے والا شخص اپنے بیٹری کے سیل سے جڑا نقش و نگار گودنے والا آلہ سجائے گاہکوں کو اپنی گودی ہوئی تصویروں کے نمونے دکھایا کرتا تھا۔ شہر کی گلیوں میں پھیری لگانے والوں کو تو شمار کرنا مشکل تھا۔ بڑھیا کے کاتے والا، قلفی والا، چوڑی میں چوڑی پرونے کا کمال دکھانے والا اور وہ چورن والا ضرور آتا جو ایک کاغذ پر انار دانے کا چورن نکال کر اس کے اوپر کوئی پاؤڈر چھڑکتا اور پھر اگلے منظر کا انتظار کرنے والے بچّوں کو حیران کر دینے والے کچھ قطرے ٹپکاتا اور چورن کی چھوٹی سے ڈھیری پر بڑا سا شعلہ اٹھتا، بچے تالیاں بجاتے اور

چورن کے خریدار کے نصیبوں پر رشک کرتے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ میری مٹھی میں دبا ایک پیسہ دبا کا دبا رہ جاتا کیونکہ چورن دو پیسوں میں آتا تھا۔ جب سب آ کر چلے جاتے تو سیر بین میں دنیا کی سیر کرانے والا آتا۔ اس کے بڑے سے ڈبے کے اندر تصویریں گھوما کرتیں اور بچے اس میں کھلی کھڑکیوں میں جھانکتے اور کبھی پیرس کے نظارے کرتے اور کبھی لندن کے، اور مجھے اس میں دکھائی جانے والی 'بارہ من کی دھوبن' یاد ہے جو کوئی کھائی پیی ماڈل ہوتی تھی جس کا بدن ذرا کھلا ہوتا تھا، اس کا دھوبن ہونا آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔

اندھا چھولے والا

اگر کوئی آواز کسی شہر کی پہچان ہوتی ہے تو وہ روڑکی کے اندھے چھولے والے کی صدا تھی۔ وہ کالے چھولوں کے پتیلا اٹھائے کہیں سے ریل گاڑی میں آتا تھا اور بڑے بازار میں اپنا کاروبار جماتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ دس گیارہ برس کا ایک لڑکا ہوتا ورنہ وہ اپنے سارے کام خود ہی کرتا۔ آواز لگاتا جاتا اور ڈھاک کے پتے پر بڑے چمچے سے چھولے نکال کر اور ان پر مصالہ چھڑک کر گاہکوں کو دیتا جاتا۔ کیا مجال کسی کو کم اور کسی کو زیادہ چھولے دے دے۔ لقمہ کھانے کے لئے اوپر ایک پتے کا ٹکڑا بھی رکھ دیتا۔ سارا مزا اس کے چھولوں سے زیادہ مصالوں میں ہوتا جو وہ بڑی مہارت سے چھڑکتا تھا۔ اسے سکّوں کی خوب پہچان تھی۔ اتنی کہ ایک بار مجھے کہیں پڑا ایک دھیلا مل گیا۔ اسے اپنی چھوٹی سے مٹھی میں دبائے پہنچا اور اس کی ہتھیلی پر رکھ کر کہا کہ مجھے چھولے دیدو۔ اس نے سکّے کو ٹٹول کر دیکھا اور ایک چھوٹے سے پتّے پر تھوڑے سے چھولے دے دیئے لیکن انکار کر کے میرا دل نہیں دکھایا۔ ہم پاکستان چلے گئے لیکن

اندھا چھولے والا یاد رہا۔ اب ادھر فیس بک پر اپنے بچپن کی یادیں لکھتے ہوئے روڑکی والوں سے رابطہ ہوا تو اپنے یونس حلوائی کے پوتے محمود میاں بڑے کام کے نکلے۔ ان سے جو معلومات مانگتا ہوں وہ فراہم کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ ان سے اندھے چھولے والے کا ذکر کیا۔ اپنے روڑکی کے لہجے میں بولے کہ ان کا ذکر سنا ہے لیکن انہیں دیکھا نہیں۔ البتہ ان کی جگہ بیٹھ کر ایک اور شخص اب بھی اسی طرح چھولے بیچتا ہے۔ میں نے محمود سے کہا کہ ہونا ہو یہ وہی لڑکا ہوگا جو کبھی کبھی ان کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ محمود میاں اپنا کیمرہ اٹھا کر اس کا انٹرویو کرنے روانہ ہوگئے۔ پتہ چلا کہ جسے ہم اندھا چھولے والا کے نام سے جانتے تھے ان کا نام تاراچند تھا جو ایک قریبی قصبے لنڈھورے سے ٹرین میں روڑکی آیا کرتے تھے۔ وہ سنہ ۷۵ میں مرگئے۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے نے کاروبار سنبھالا۔ وہ بھی بوڑھا ہو کر چل بسا۔ اب ان کا پوتا نریندر اسی انداز کے اتنے ہی لذیذ چھولے بیچتا ہے۔ وہی ڈھاک کے پتے پر، البتہ لقمہ اٹھانے کے لئے وہ چھوٹا پتہ نہیں، پلاسٹک کا چمچہ دیتا ہے۔ اس کے دادا آنجہانی تاراچند نے (میرے دھیلے سمیت) ٹھیک ٹھاک پیسے کمائے، انہوں نے روڑکی میں مکان خرید لیا اور لنڈھورے کو خیرباد کہہ آئے۔ ہم نے ان کے پوتے نریندر کی تازہ تصویر دیکھی۔ بالکل اندھے چھولے والے جیسے ہی نظر آئے۔ محمود میاں نے ان سے فرمائش کی کہ اپنے دادا کی 'چھولے، چھولے' کی صدا لگائیں۔ نئے زمانے کے جو ٹھہرے۔ شرما کر انکار کر دیا۔ اس پر یاد آیا کہ ہمارے گھر پر ایک مسلمان چھولے والا بھی آتا تھا۔ یخنی میں پکے ہوئے چھولے جن میں چھوٹے چھوٹے کوفتے پڑے ہوتے تھے، چینی کے صاف ستھرے پیالوں میں دیتا تھا اوپر سے ہرا مصالحہ اور کتری ہوئی پیاز چھڑک کر۔ غضب کا ذائقہ تھا۔ کون تھا۔ کہاں سے آتا تھا اور پھر کدھر گیا، خبر نہیں لیکن ویسے لذیذ

چھوڑے پھر کبھی نہیں کھائے۔ یہاں کہہ سکتے ہیں کہ 'تماشا دکھا کر مداری گیا۔

میرا دروازہ

یونس حلوائی کے پوتے محمود میاں نے عجب کام کیا۔ ہمارے گھر کی بغلی گلی میں گئے اور گھر میں آنے جانے کے دروازے کی تصویر اتار کر مجھے بھیج دی۔ یہی مکان تھا میں نے جس میں ہوش سنبھالا اور گھر سے باہر جو پہلا قدم رکھا، اسی دروازے کے راستے رکھا ہوگا جو آج بھی قدیم اور بوسیدہ دیواروں کے بیچ جڑا ہوا ہے، وہی چوبی دروازہ، وہی دہلیز اور وہی جھولتی ہوئی زنجیر۔ اسی دروازے سے ہر صبح دودھ والا آواز دیتا تھا۔ اسی دروازے کو ہر صبح مہترانی کھٹکھٹاتی تھی۔ اسی دروازے سے گھر کی ملازمائیں آتی تھیں، سقّہ قریبی کنویں سے مشک بھر کر لاتا اور آواز دیتا تاکہ بیبیاں پردے میں چلی جائیں۔ اسی کے سامنے سبزی ترکاری والا صدا لگاتا۔ اسی راستے گھر کے لڑکے تیار ہو کر اسکول کو جاتے اور بہنوں کو لے جانے والی ہاتھ گاڑی اسی دروازے پر لگتی تھی۔ پردہ دار خواتین کو لانے لے جانے والی ڈولی بھی یہیں آتی ہوگی اور کہار یہیں آواز دیتے ہوں گے مگر وہ مجھے یاد نہیں۔ اسی دروازے پر روز صبح وہ گڈریا آتا جو ہماری بکری کو ریوڑھ کے ساتھ چَرانے کے لئے لے جاتا تھا۔ پھر دن بھر بھانت بھانت کے سودے والے یہیں ٹھہر کر آواز لگاتے تھے۔ مجھے وہ شخص یاد ہے جو مٹی کے مٹکے میں سرکہ بیچنے آتا تھا اور مجھے شیشے کی بوتل دے کر نیچے سے سرکہ لانے کو کہا جاتا۔ میں دروازہ کھول کر سرکے والے کو اندر بلاتا، سرکہ اصلی ہے یا نہیں، یہ دیکھنے کے لئے اس سے کہتا کہ فرش پر جمی اینٹوں کے بیچ ذرا سا سرکہ ڈال کر دکھاؤ۔ وہ دکھاتا اور اینٹوں کے درمیان جھاگ اٹھتا تو میں بوتل بھر کر سرکہ لے لیتا۔ اسی دروازے پر

کبھی کبھی دُھنیا آتا اور اس سے پرانی روئی دھنکوائی جاتی۔ یہیں قلعی گر آ کر گھر کے تمام برتن لے جا کر اسی گلی میں اپنی بھٹّی لگا کر اس کی دھونکنی چلاتا اور تانبے پیتل کے سارے برتنوں کو ذرا سی دیر میں چمکا دیتا، میں بھٹی کے قریب اکڑوں بیٹھ کر پورا مشاہدہ کرتا۔ کبھی کبھی قینچی اور چاقو پر دھار بٹھانے والا بھی آتا اور ایک پاؤں سے پتھریلا پہیہ گھما کر جو چنگاریاں نکالتا، بچے حیرت سے دیکھا کرتے۔ ان ہی دنوں سِل بٹّے والا آواز لگاتا: سِل بٹّہ رہالو، سل بٹہ رہالو۔ اسی راستے کبھی کبھی لکڑہارا بھی آتا۔ مجھے تکئے کے سائیں یاد ہیں جنہیں لکڑیاں چیرنے کے لئے بلایا جاتا۔ ان کے تکئے کے پاس ہی لکڑیوں کی ٹال تھی، خشک لکڑی چن کر اور بیل گاڑی میں لدوا کر وہی لاتے ہوں گے۔ بہت توانا تھے۔ دیکھتے دیکھتے ساری لکڑیاں چیر ڈالتے تھے۔ اسی دروازے پر ٹوکرے میں بھرے ہوئے مرتبان اور چینی کے برتن لے کر وہ شخص بھی آتا تھا جو پرانے لچکے اور گوٹے کے بدلے برتن دیا کرتا تھا۔ اسی دروازے پر گداگر بھی آتے تھے اور نقدی نہیں، ایک روٹی کا سوال کیا کرتے تھے۔ امّاں روٹی پر رکھ کر کھانا بھجواتی تھیں جسے وہ اکثر وہیں بیٹھ کر کھا لیا کرتے تھے اور پانی بھی مانگتے تھے۔ اسی دروازے پر جمعرات کے روز فقیر بھی آتے تھے۔ یہ فقیر کسی اور طرح کے ہوتے تھے، شاید صوفی صفت جنہیں ایک پیسہ دیا جاتا تھا اور وہ خوشی خوشی چلے جاتے تھے۔ اسی دروازے پر گھر کے لڑکوں کو ٹیوشن پڑھانے ماسٹر صاحب بھی آتے تھے جنہیں مہینے کے پندرہ روپے ملا کرتے تھے، میں حساب لگاتا تھا کہ اس طرح وہ روز آٹھ آنے کماتے ہیں، خوب مزے کرتے ہوں گے۔ زیادہ تر آنے والے صبح کے وقت آتے تھے لیکن جو منظر میں کبھی نہیں بھول سکتا وہ میری بکری کلّو کا شام کے وقت آنا تھا۔ جیسے کہ میں نے بتایا، ہمارا گڈریا ریوڑھ کے ساتھ چَرانے کے لئے گھر گھر بکریاں ہانکتا

حوالے جاتا تھا لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ وہ شام کو نہیں آئے گا، آپ خود اس کے باڑے پر آیئے اور اپنی بکری لے جایئے۔ چونکہ کلّو کو میں ہی پالتا تھا، اسے ریوڑھ سے لانے کی ذمے داری بھی میری تھی۔ جس وقت میں وہاں جاتا، ریوڑھ واپس آ رہا ہوتا۔ اتنی بہت سی بکریوں میں ہماری کلّو بھی ہوتی تھی۔ میں ذرا بلندی سے اس کا نام لے کر پکارتا، وہ اسی مجمع میں منہ اونچا کر کے جواب دیتی اور پھر میرے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی، پُر پیچ گلیوں سے گزرتی میرے ساتھ اسی دروازے کے راستے گھر آ جاتی۔
ایک روز خدا جانے کیا ہوا، میں جانا بھول گیا۔ دن ڈھل رہا تھا کہ اچانک گلی سے کلّو کی آواز آئی۔ اب مجھے یاد آیا کہ میں کلّو کو لانا بھول گیا ہوں، جھانک کر نیچے گلی میں دیکھا، کلّو دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی آوازیں دے رہی تھی۔ میں دوڑ کر نیچے گیا، اسے اندر لایا اور گلے سے لگایا، وہ بھی دیر تک گلے سے لگی رہی، ریوڑھ جا کر وہ خیر سے گابھن ہوئی اور اس کے ہاں بیٹا ہوا جس رنگ بادامی تھا، باپ پر گیا ہوگا۔ اس کا نام شیرا ٹھہرا اور ذرا بڑا ہو کر وہ بھی ریوڑھ جانے لگا۔ مجھے شیرا کا بھی پہلے روز ریوڑھ سے واپس آنا یاد ہے۔ گرمیوں کے دن تھے اور چھوٹے بڑے سارے بستر انگنائی میں لگے ہوئے تھے۔ اتنے میں کلّو اپنے بیٹے کو لے کر آئی۔ تھکا ہارا شیرا گرتا پڑتا سیڑھیاں چڑھ کر انگنائی میں آیا جہاں میرے چھوٹے بھائی کا چھوٹا بستر لگا ہوا تھا۔ شیرا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اقبال کے پلنگ پر چڑھا، تکیے پر سر رکھا اور کروٹ لے کر سو گیا۔

غرض یہ کہ اس دروازے کے راستے ہم نے نعمتیں ہی آتے دیکھیں، ہاں اگر کچھ جاتے دیکھا تو مجھے اپنے کنبے کا پاکستان جانا یاد ہے جو اس گھر، اس مکان، اس شہر اور اس ملک کو چھوڑ کر گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔
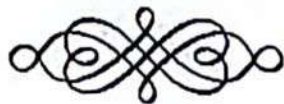
میرے دوست، میرے ہمجولی

اب ہر صبح کا منظر یہ ہوتا، میرے تین بڑے بھائی گورنمنٹ ہائی اسکول کی جانب چلے جاتے۔ میں اپنا بستہ کاندھے پر لٹکائے، تختی جھلاتا ہوا پرائمری اسکول نمبر چار کی طرف چل پڑتا، تختی کے لئے سینٹھے کا قلم مولوی غفران کی دکان سے ملتا تھا، وہ مہربان ہوتے تو اپنے تیز چاقو سے قلم بنا دیتے اور اس پر ترچھا قط لگا کر اس کے بیچ چھوٹا سا کٹ بھی لگا دیتے تھے۔ سارے بچے خوش نویسی اسی تختی پر سیکھتے اور حساب کے سوال سلیٹ پر کرتے تھے۔ بعد میں کسی نلکے پر وہ تختی دھو کر ملتانی مٹی سے پوتی جاتی تھی جسے ہم ہوا میں لہرا لہرا کر سکھاتے تھے۔ شاید یہ کارروائی ہفتے کے روز ہوتی تھی کیونکہ تختی لہراتے ہوئے لڑکے گاتے جاتے تھے: تختی پہ تختی، تختی پہ دانا، کل کی چھٹّی پرسوں کو آنا۔

ہمارا یہ اسکول بھی کمال کا تھا۔ ہمیں الف بے پے پڑھانے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ سکھایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ہم سے مٹّی کے برتن بنوائے جاتے، بانس سے بنے ہوئے برش اور رنگوں سے بھرے پیالوں سے ہم مصوری کرتے، انگلیوں سے گھمائی جانے والی تکلی سے ہم روئی کے دھاگے کاتا کرتے تھے، بعد میں سنا کہ یہ

گاندھی جی کی فرمائش پر ہوتا تھا۔ قریب کے باغ میں ہر لڑکے کو ایک ایک کیاری دی جاتی تھی جس میں ہم پودے لگا کر باغبانی کیا کرتے تھے۔ اور تو اور محاذ پر بھیجنے کے لئے فوج کو جو لوہا درکار تھا اس کی خاطر ہم لڑکوں کے ذمے یہ کام تھا کہ جہاں کہیں پڑا ہوا جیسا بھی لوہا ملے بچّے اسے لا کر اسکول میں جمع کرائیں چنانچہ اسکول کے ایک کونے میں لوہے کے انبار لگ گئے۔ ہم سنا کرتے تھے کہ اس لوہے سے بم بنائے جائیں گے۔ ان ہی دنوں کوئی نیا نصاب رائج ہوا تھا اور جرمن ماہروں کی مدد سے نئی درسی کتابیں چھاپی گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے ڈرائنگ سکھانے کے انوکھے طریقے بتائے گئے تھے۔ لیکن مجھے جو کتاب سب سے زیادہ یاد ہے وہ اردو کی تھی اور دلّی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے جاری ہوئی تھی۔ اس وقت کیا ہندو کیا مسلمان، سارے بچے اردو پڑھتے تھے۔ ان کے خیال سے ایسی کتابیں لکھی گئی تھیں جو ہر مذہب کے بچوں کے لئے مناسب ہوں۔ مثال کے طور پر مجھے اپنی پہلی کتاب کا پہلا سبق آج تک یاد ہے۔ اس کے اوپر ایک تصویر تھی جس میں سورج طلوع ہو رہا تھا، پرندے اڑ رہے تھے اور پھول کھل رہے تھے۔ سبق کا متن یوں تھا:

خدا ایک ہے۔ وہی رام ہے۔ اسی نے سب کو پیدا کیا۔ سورج بنایا۔ چاند بنایا۔ دنیا کی ہر چیز بنائی۔ ہم سب اس کی پوجا کرتے ہیں۔

اس کے بعد ایک مضمون تھا کہ مصر میں جب کسی گھر میں بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا نام کیسے رکھا جاتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ تھی کہ گھر میں تین شمعیں روشن کی جاتی ہیں اور ہر شمع کا ایک ایک نام رکھا جاتا ہے۔ جو شمع سب سے زیادہ دیر تک جلتی تھی اسی کے نام پر بچے کا نام رکھ دیا جاتا تھا۔ مضمون کی عبارت کچھ ایسی بھولی بھولی سی تھی کہ یاد رہ گئی۔

اس طرح سنہ ۴۴ آ گیا اور گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلے کے امتحان ہونے لگے۔ مجھے بھی بٹھایا گیا۔ وہ میری زندگی کا پہلا امتحان تھا اور مجھ پر ایسی بوکھلاہٹ سوار تھی کہ پہلے ہی سوال میں گڑ بڑا گیا۔ بلیک بورڈ پر سوال لکھا تھا کہ بیس میں چار کتنی مرتبہ شامل ہے۔ میں نے خدا جانے کیا جواب لکھا لیکن اس جواب کا خلاصہ مجھے یاد ہے: پتہ نہیں۔ البتہ جب زبانی امتحان شروع ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ دس تک گنتی سناؤ تو میں نے سو تک سنادی اور پاس ہو گیا۔

اس طرح پرائمری اسکول نمبر چار کو میں نے خیر باد کہا اور انگریزوں کے بنائے ہوئے شاندار گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔ اسکول کا پورا نام کچھ اور تھا جسے یاد رکھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی سو میں نے بھلا دیا لیکن اسکول میں ایسا جی لگا کہ وہ بڑی عمر تک خوابوں میں آتا رہا اور خواب بھی ایسے کہ اسکول کی عمارت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس خواب نے اتنا ستایا کہ جب ۳۵ سال بعد میں روڑکی گیا تو اپنے ہم جماعت دوستوں سے اصرار کیا کہ پہلے مجھے اسکول دکھا دو تا کہ ان خوابوں سے مجھے نجات ملے۔ جس اسکول تک ہم سب پیدل جایا کرتے تھے، اس روز میرے کلاس فیلو مچل گئے کہ رکشہ پر جائیں گے۔ اس روز ادھیڑ عمر طالب علموں کا قافلہ اسکول گیا جو سلامت تھا، صرف سائنس روم کی چھت گر گئی تھی۔ اس روز وہ درخت بھی دیکھا جو شجر کاری کی کسی مہم کے تحت ہم بچوں نے لگایا تھا اور اب بہت بڑا اور گھنا ہو چکا تھا۔ اسکول کا میدان دیکھ کر وہ کھیلنا کودنا، ہارنا جیتنا، ورزش کرنا یاد آیا جسے پی ٹی کہا جاتا تھا۔ اسکول کے سارے بچے ہر دوپہر قطاروں میں کھڑے ہو کر ورزش کیا کرتے تھے۔ وہیں کلاس مانیٹر ایک بڑے تسلے سے ہر لڑکے کو ایک ایک چمچہ بھر کر چنے مُرمُرے دیا کرتا تھا۔ ایک بار نئے ہیڈ ماسٹر آئے۔ ان کا نام عبداللطیف تھا۔ بڑی

وضع قطع کے انسان تھے، بار بار ٹوپی اتار کر سر کھجایا کرتے تھے۔انہوں نے حکم جاری کیا کہ چنے مرمرے کھانے سے لڑکوں کی صحت پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں۔انہیں رات بھر کے بھگے ہوئے چنے کھلائے جائیں جن میں تھوڑی سی ادرک بھی پڑی ہو۔اب سوچئے اس سرسبز میدان میں، جس میں سنا کرتے تھے کہ ایک بار کوئی ہوائی جہاز بھی اترا تھا، سارے لڑکوں کو رات کے بھگے ہوئے چنے کھلائے گئے، پھیکے، بے مزا اور اوپر سے سخت۔دو چار دن یہی عمل ہوا۔پھر جو روڑی پر آنے والی گھٹا ٹوٹ کے برسی تو فیلڈ میں چنے کی ایسی فصل اگی کہ خدا کی پناہ۔اس کے بعد ہمیں گھوڑوں کی غذا ملنی بند ہوئی اور کھیت مزدوروں کو بلا کر چنے کی فصل کاٹی گئی۔ہمارے ڈرل ماسٹر شیروانی صاحب تھے۔ہم سوچتے تھے کہ ان کا یہ نام اس لئے ہے کہ وہ ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے۔اچھے انسان تھے۔

صبح کے وقت سب سے پہلے اسمبلی ہوتی تھی۔لڑکوں کو مقررہ وقت پر آنے کی ہدایت تھی۔دیر ہو جائے تو اسکول کا گیٹ بند ملتا تھا۔سارے لڑکے قطاروں میں کھڑے ہو کر کچھ گاتے تھے، اب یاد نہیں، پھر ہمارے پسندیدہ ٹیچر مسٹر سائمن خاص خاص خبروں پر نشان لگا کر تازہ اخبار لے کر آتے تھے اور ہمیں وہ خبریں سناتے تھے۔جاپان پر ایٹم بم گرائے جانے کی خبر انہوں ہی نے سنائی تھی۔ان کی سنائی ہوئی ایک اور خبر مجھے یاد ہے۔وہ یہ کہ کسی راہ چلتے شخص پر کسی نے حملہ کر دیا۔اس شخص نے خود کو بچانے کے لئے اپنا سر ایک موری میں دے دیا۔حملہ آور خود ہی تھک کر چلا گیا اور وہ شخص یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کہ تم پر حملہ ہو تو اپنا سر بچاؤ۔اب سوچئے مجھے یہ خبر یاد رہی، بچے کون سی حمد یا دعا پڑھتے تھے، یہ یاد نہ رہا۔

ہمارے دوسرے پسندیدہ استاد مسٹر پیٹر تھے۔وہ ہماری تیسری جماعت کے

کلاس ٹیچر تھے۔ انہوں نے ہماری انگریزی کی تدریس شروع کی اور ان کے یاد کرائے ہوئے فقرے بھی خوب تھے۔ نام اور عمر پوچھنے کے علاوہ انہوں نے سکھایا: Open the window. Shut the door اس کے علاوہ انہوں نے لڑکوں کو دس تک انگریزی گنتی بھی سکھائی، وہ میرے زبانی امتحان کے وقت موجود تھے اور مجھ سے سو تک گنتی سن چکے تھے اس لئے انہوں نے مجھے گنتی سکھانے کی زحمت نہیں کی۔ میں جب ۳۵ سال بعد روڑکی گیا تو مسٹر سائمن زندہ تھے، بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور کسی دکان کے اوپر ایک کمرے کے فلیٹ میں عمر کے آخری دن گزار رہے تھے۔ انہیں نہ میں یاد تھا نہ میرے بھائی۔ مسٹر پیٹر ریٹائر ہو کر شاید دہرادون جا چکے تھے۔ مجھے اپنے کئی استاد یاد ہیں۔ سادھورام ہمارے ریاضی کے استاد تھے، اس مضمون کو اُن دنوں حساب کہتے تھے۔ ایک اور استاد دو بے جی تھے، چھوٹا سا قد اس پر بڑی سی ڈاڑھی اور ڈھیلا ڈھالا نیکر پہنتے تھے۔ ان کا لہجہ انگریزوں جیسا تھا اس لئے جب کبھی ہمیں انگریزی املا لکھواتے تو آدھے لفظ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے۔ ان کا بیٹا ہمارے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ ایک روز اس نے کلاس میں دو بے جی کو پتا جی کہہ دیا، بڑی سخت ڈانٹ پڑی۔ اسی طرح بڑی جماعتوں کو سائنس پڑھانے والے پانڈے جی تھے۔ دیکھنے میں بڑے سائنس داں لگتے تھے۔ ہمارے اسکول میں کئی چپراسی تھے۔ ان میں سے ایک صبح کے وقت ہر لڑکے کے ڈیسک میں لگی دوات میں تازہ سیاہی بھرا کرتا تھا۔ ہم اپنی ساری لکھائی نِب سے کرتے تھے، انگریزی کے لئے جی کا نِب اور اردو کے لئے زیڈ کا نِب۔ جی کے نِب سے چار سطروں کی کاپی میں نہایت عمدہ انگلش لکھی جاتی تھی۔ اسی طرح ایک بہت پرانا چپراسی تھا جو میرے سب سے بڑے بھائی کے زمانے میں بھی تھا۔ جس روز دنیا میں تعلیم کا دن منایا جاتا، اُس روز ہمارے اسکول

کے سارے بچّوں کا جلوس نکالا جاتا۔ بڑے بھائی ویسے ہی جلوس کے ساتھ چھوٹا ڈرم بجایا کرتے تھے اور وہی پرانا چپراسی بڑا ڈرم بجاتا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ استاد کو سب یاد تھا۔ انہوں نے چھوٹا ڈرم مجھے سونپ دیا اور بڑا ڈرم اسی چپراسی کے حصے میں آیا جو مجھے بھائی کے زمانے کے قصے سناتا تھا۔ جلوس میں بچوں سے ایک نعرہ بھی لگوایا جاتا تھا: جہالت کا منہ کالا، علم کا بول بالا۔

لیکن جو استاد مجھے عمر بھر یاد رہیں گے وہ کندن سنگھ جی تھے جو میرے سب سے بڑے بھائی کو بھی پڑھا چکے تھے اور ان کے اسکاوٹ ماسٹر بھی رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ بھائی کو اسکاوٹ تحریک سے بہت لگاو تھا۔ نہ معلوم کیوں میرا بھی اسکاوٹ سرگرمیوں میں بہت جی لگتا تھا۔ کندن سنگھ جی یوں تو ریٹائر ہو کر جا چکے تھے لیکن میرے زمانے میں وہ دوبارہ آ گئے اور اسکاوٹ تحریک شروع کر دی۔ انہوں نے دیوار پر ایک نوٹس لگا دیا کہ جو لڑکے اسکاوٹ بننا چاہیں اپنے نام لکھ دیں۔ میں نے جھٹ لکھ دیا۔ کندن سنگھ جی کو میرے بھائی اصغر علی خوب یاد تھے۔ انہوں نے مجھے بھی بہت عزیز جانا اور میرا اشتیاق دیکھتے ہوئے مجھے ٹروپ لیڈر بنا دیا۔ (۳۵ برس بعد میر اجانا ہوا تو ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے جو لڑکپن میں میرے ٹروپ میں شامل تھے) ہمیں لارڈ بیڈن پاول کا یہ اصول سکھایا گیا کہ ہر روز کم سے کم ایک بھلائی کا کام ضرور کیا کرو۔ وہ ہم کرتے تھے اور اگلے روز کی میٹنگ میں ہر لڑکا بتاتا تھا کہ اس نے راستے کا پتھر ہٹایا یا کسی نابینا کو سڑک پار کرائی۔ A good deed a day پر میں آج ستّر برس بعد بھی عمل کرتا ہوں۔ اور مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں نے بڑے بھائی کو بتایا کہ کندن سنگھ ابھی زندہ ہیں تو انہوں نے اپنے استاد کے نام نہایت جذباتی خط لکھ کر مجھے دیا کہ جیسے بھی بنے انہیں پہنچا دوں۔ میں نے وہ خط روڑکی میں فیض محمد کو

بھیجا، اس کا جواب آیا کہ کندن سنگھ چل بسے۔

فیض محمد کا ذکر آیا تو سوچتا ہوں اب اپنے ان ہم جولیوں کو یاد کروں جن کے ساتھ میں پہلے پہل کھیلا کرتا تھا۔ ان میں سرفہرست غلام صابر ہے جو شکر ہے کہ ابھی زندہ ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کو کسی نہ کسی بہانے یاد کرتے رہتے ہیں۔

مجھے یقین ہے میرا بچپن کا پہلا دوست بلّی تھا۔ اس کا پورا نام بلّی رام رہا ہوگا۔ میرا ہم عمر تھا اور بالکل پڑوس میں رہتا تھا۔ ہم کمپنی باغ چلے جاتے اور گھنٹوں کھیلا کرتے۔ میری بکری کلّو میرے ساتھ ہوتی جسے ہم کٹوے سے آم کی کونپلیں توڑ کر کھلاتے تھے۔ بلّی کے ساتھ رہ کر میں نے ہندو کلچر قریب سے دیکھا۔ مجھ پر ابّا امّاں کی کوئی روک تھام نہ تھی۔ میں پڑوس کے گھر میں چلا جاتا، ان کے گھر کا کھانا مجھے خصوصاً آلو کی بھاجی بہت پسند تھی (اور آج تک ہے) بلّی کی ماں کو ہم سب بھابی کہا کرتے تھے، بہت موٹی تھیں لیکن اپنے دونوں بیٹوں کے ہمارے ہاں آنے جانے پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ شلجم کا پانی اور کُٹی ہوئی لال مرچ کا ایسا عمدہ اچار ڈالتی تھیں کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔ جاڑوں کی دوپہروں میں کالی ماش کی کھچڑی کے ساتھ وہ اچار غضب کا لطف دیتا تھا۔ بھابی بہت موٹی تھیں، خدا جانے کیسے ان کے پیٹ میں بچہ آ گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ زچگی کے دوران مر گئیں۔ ان کی ارتھی بڑی مشکل سے نیچے اتاری گئی۔ ہمیں جنازے کے ساتھ مرگھٹ جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بلّی بہت دن اداس رہا مگر ہمارا کھیلنا جاری رہا۔ ہم مل کر منصوبے بنایا کرتے تھے کہ کسی طرح تلواریں بنالیں تاکہ جرمن فوجیں شہر میں داخل ہوں تو ان سے لڑیں۔ ہندوؤں کی عجیب رسمیں تھیں، آئے دن کوئی نہ کوئی تہوار مناتے تھے اور سب میں رنگوں کا دخل ضرور ہوتا تھا۔ کبھی آنگن میں رنگولی سجائی جاتی اور دیوالی میں

قندیلیں روشن کرنا اور گھر کی منڈیروں پر دیئے جلانا محلّہ کے سارے ہی لڑکوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ہمارے ہی علاقے میں ڈاکٹر جمنا پرشاد کی بڑی حویلی تھی جس کی بالائی منزل پر ساری منڈیروں کے اوپر سینکڑوں چراغ روشن کئے جاتے تھے جس کے لئے ڈاکٹر صاحب کو کتنے ہی رضا کار یعنی ہم لڑکے لوگ مل جاتے تھے۔ ہمارے محلے بی ٹی گنج میں سال کے سال بڑی رام لیلا کھیلی جاتی تھی۔ بہت بڑا اسٹیج بنایا جاتا تھا جس پر کئی راتوں تک رامائن کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ میں اور بلّی بلا ناغہ ہر رات جاتے تھے اور اس رات تو کسی حال ناغہ نہیں کرتے تھے جس رات سیتا سوئمبر ہوتا تھا۔ اس رات سیتا جی کے ہاتھ کے امیدواروں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اعلان یہ ہوتا تھا کہ جو کوئی بہت بڑی کمان، اندر دھنش کو توڑ دے گا، سیتا اس سے بیاہ دی جائیں گی۔ دنیا بھر کے امیدوار آتے تھے جن میں راون بھی شامل ہوتا تھا اور رام چند جی بھی۔ کمان توڑنا تو دور کی بات ہے، لوگوں سے وہ وزنی دھنش اٹھتا ہی نہیں تھا۔ آخر رام چند جی کی باری ہوتی تھی۔ وہ کمان کو یوں اٹھاتے تھے جیسے وہ دھنش نہیں شکر کا بتاشا ہو ، اور پھر اسی سہولت سے اس کے دو ٹکڑے کر ڈالتے تھے جس پر سیتا ان کے گلے میں مالا ڈال دیتی تھیں اور ہم رام چندر جی کو داد دیتے ہوئے رات گئے گھروں کو لوٹ آتے تھے۔ رام اور سیتا اپنے ہی شہر کے دو نوجوان ہوتے تھے اور پورے ڈرامے کے دوران اسٹیج کے پیچھے سے کوئی شخص اداکاروں کے مکالمے کانا پھوسی کے انداز میں پڑھتا تھا جنہیں اداکار اونچی آواز میں دہراتے تھے۔ یہ ساری چالیں ہم نے چھپ چھپا کے دیکھ لی تھیں۔ بلّی کے ساتھ تہوار منانے کی ہمیں اجازت تھی، بس ہولی سے ہم پرے پرے رہتے تھے۔ پڑوسیوں نے بھی کبھی ہم پر زور نہیں دیا۔ ہماری عید پر وہ سویّاں بہت شوق سے کھاتے اور بقر عید پر بلّی کا بڑا بھائی ہمارا شامی کباب فرمائش

کر کے مگر چھپ چھپا کے کھاتا تھا۔ پینتیس سال بعد جب میں روڑکی گیا اور جاتے ہی بلّی کو پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ مر چکا ہے۔ دکھ ہوا۔ ڈاکٹر جمنا پرشاد اور ان کی بیوی بھی مر چکی تھیں جن کے گھر کی پکی ہوئی کڑھی مجھے بہت پسند تھی۔ ان کی جوان بیٹی نے پہلے ہی خودکشی کر لی تھی، ان کے دو بیٹے شمشیر اور سمراٹھ بڑے ہو کر ڈاکٹر بن چکے تھے۔ میں ان سے ملا، ان کو میرا چھوٹا بھائی اقبال یاد تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ ان کی حویلی کی منڈیروں پر دیوالی کے دیئے اب بھی جلائے جاتے ہیں۔

غلام صابر

ہمارے گھر دو خواتین کام کرنے آتی تھیں، ایک زُلّی یعنی زلیخا کی ماں جن کا ایک بیٹا غلام صابر تھا اور دوسری حسینی بوا جو شہر کے امام باڑے کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ ان کا بھی ایک بیٹا تھا جس کا اصل نام ذہن سے نکل گیا لیکن سب اسے نھّو کہتے تھے۔ نھّو اور غلام صابر میرے ہم عمر تھے۔ مائیں جب کام پر آتیں تو ان کو ساتھ لے آتی تھیں۔ ہمارے گھر آ کر یہ دونوں میرے ساتھ کھیلتے اور رفتہ رفتہ گہرے دوست بن گئے۔ غلام صابر کی ماں بہت غریب تھیں اور مفلسوں کے محلے میں رہتی تھیں۔ وہیں تکیہ تھا، کسی بزرگ کا مزار تھا اور صوفیوں کی بیٹھک تھی۔ یہ عجب لوگ تھے، ہر جمعرات کو خیرات مانگنے نکلتے تھے۔ ابّا اُس روز ایک ایک پیسے کی ریزگاری تیار رکھتے تھے اور ہر شخص وہ ایک پیسہ لے کر سلام کرتا ہوا چلا جاتا تھا۔ غلام صابر کی ماں ہمارے گھر کے ماحول سے بہت متاثر تھیں، انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر توجہ دی۔ غلام صابر سنہ ۴۴ء میں میرے ساتھ گورنمنٹ اسکول کے امتحان میں بیٹھا اور آسانی سے پاس ہو گیا۔ پھر تو ہمارا برسہا برس ساتھ رہا۔ وہ نہ صرف عمر میں بلکہ قد کاٹھ میں بھی دوسرے

لڑکوں سے بڑا تھا۔ اسکول میں فٹ بال اور خاص طور پر ہاکی بہت شوق سے کھیلتا تھا۔ وہ جس ٹیم میں بھی ہوتا وہی جیتا کرتی تھی اور ظاہر ہے میں بھی اسی ٹیم میں ہوتا۔ وہ شہر کی نہر میں ماہروں کی طرح تیرتا اور پُل کے اوپر سے نہر میں چھلانگ بھی لگاتا تھا جسے میں حیرت سے دیکھا کرتا تھا اور ڈرتا تھا کہ وہ کہیں مر نہ جائے۔ ہم سب لڑکے ایک شرارت کرتے تھے۔ نہر کے برابر میں ایک بڑا تالاب تھا جو نہر سے جُڑا ہوا تھا، کالج کے لڑکوں کی ساری کشتیوں کے لئے تالاب میں بڑا سائبان بنا ہوا تھا۔ اسی میں ایک پرانی، بیکار سی کشتی پڑی رہتی تھی جسے کشتیوں کا رکھوالا آٹھ آنہ گھنٹے کے حساب سے شہر کے لڑکوں کو دے دیا کرتا تھا۔ ہم سارے لڑکے پیسے جمع کر کے تالاب میں کشتی چلایا کرتے تھے۔ غلام صابر پر عجب دھن سوار ہوتی، وہ کشتی پر کھڑا ہو کر اور ٹانگیں پھیلا کر کشتی کو زور زور سے ہلاتا جلاتا تھا۔ باقی لڑکے، جنہیں تیرنا نہیں آتا تھا، ہراساں ہو جاتے اور احتجاج کرتے۔ میں سوچا کرتا کہ اگر اماں کو غلام صابر کی اس خرمستی کا علم ہو گیا تو وہ اس کا منہ نوچ لیں گی۔ وہ پڑھائی میں اچھا رہا لیکن کبھی اسکاوٴٹنگ میں شریک نہیں ہوا۔ پہلی بار اسے ایک بنگالن لڑکی اچھی لگی اور وہ سینما بھی شوق سے جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار وہ فلم بابر دیکھ کر آیا۔ اس فلم میں خورشید ہیروئن تھیں اور ان کا ایک گانا مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے غلام صابر کو گانے کا ایک بول سنایا: برستا ہے پانی ، مکاں جل رہا ہے۔ میں نے بڑے بھول پن سے پوچھا کہ کیا فلم میں گانے کے وقت یہی منظر دکھایا گیا تھا: برستا ہے پانی، مکاں جل رہا ہے۔ اس کا انکار سن کر میں نے سوچا ، پھر یہ فلم کس کام کی؟ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔

اس کے بعد ہندستان کو آزادی ملی، پاکستان وجود میں آیا اور ہم لوگوں نے روڑکی کو خیر باد کہہ کر کراچی کی راہ لی۔ غلام صابر وہیں رہا اور اس نے ایک کمال کیا، وہ

ہا کی باقاعدگی سے کھیلتا رہا۔ اور یہی نہیں، علاقے کے لڑکوں کو بھی کھلاتا رہا۔ اس کھیل میں اسے اتنی مہارت حاصل ہوئی کہ وہ لوگوں کی نگاہ میں آ گیا یہاں تک کہ اسے بڑی ٹیمیں اپنے ساتھ کھلانے لگیں۔ ہوتے ہوتے اس کے کھیل کی اتنی شہرت ہوئی کہ خود اس کے بقول کبھی ریلوے والے مجھے کھینچتے تھے اور کبھی یونیورسٹی والے مجھے ملازمت کی پیشکش کرتے تھے تاکہ میں ان کی ٹیم میں شامل ہو جاؤں۔ غلام صابر نے بتایا کہ اسے ملک کے کھلاڑیوں کی صفِ اوّل میں شمار کیا جانے لگا۔ غلام صابر نے شہر کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں ملازمت کی، شادی کی، اس کے دو بیٹے ہوئے جنہوں نے فوج میں جا کر ترقی کی، غلام صابر کی بیوی سنہ ۲۰۱۵ء کے قریب چل بسیں، اب دونوں بہوئیں اس کا خیال رکھتی ہیں۔ میں کبھی کبھار اس کو لندن سے فون کرتا ہوں اور اس دعا کے ساتھ کہ فون خود غلام صابر اٹھائے۔ شکر ہے کہ وہی اٹھاتا ہے۔

فیض محمد

فیض محمد سنہ چوالیس میں میرے ساتھ گورنمنٹ اسکول میں داخل ہوا تھا۔ وہ روڑکی کے پہاڑی بازار کے حکیم خضر محمد خاں کا بیٹا تھا اور بڑے سلیقے سے بن سنور کر اسکول آتا تھا۔ سر پر بڑے پھندنے والی ترکی ٹوپی اور اونچا نیکر جس میں اس کی گوری ٹانگیں جھلکتی تھیں۔ کھیل کود سے پرے رہتا اور پڑھنے لکھنے میں زیادہ جی لگاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سے کوئی گرم جوشی والی دوستی نہ تھی۔ سنہ ۴۷ء کی آزادی کے تین سال بعد ہم لوگ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے اور وقت قلانچیں بھرتا کہیں کا کہیں نکل گیا۔ میں بی بی سی سے وابستہ ہو کر برطانیہ آ گیا اور ذہن میں فیض محمد کا خیال تک نہ رہا۔ پھر اچانک ایک روز ڈاک میں ایک وزنی لفافہ آیا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں فیض محمد کا پیار

بھرا خط نکلا جس کے ساتھ اس نے اپنے والد کی، خود اپنی اور بیوی بچوں کی تصویریں بھیجی تھیں۔ پچیس سال بعد کیا ہوا کہ اس کے دل میں میری محبت جاگی۔ کسی نے کہا اور شاید ٹھیک ہی کہا کہ ایک عمر کو پہنچ کر پرانے رشتے اور تعلقات یوں جی اٹھتے ہیں جیسے کوئی سوتے سے جاگ جائے۔ بس اس کے بعد فیض محمد سے خط و کتابت ہونے لگی اور روڑکی میں ان لوگوں کی خیر خبر ملنے لگی جن کے ساتھ کھیل کر میں بڑا ہوا تھا۔ غلام صابر سے رابطہ ہوا، ننھو کی خبر ملی، اور جو بات سب سے بڑھ کر ہوئی وہ یہ کہ ہم دوستوں نے ایک بار پھر ملنے کے منصوبے بنانے شروع کئے۔ آخر ۳۵ سال بعد میں لمبا سفر طے کر کے روڑکی جا پہنچا۔ فیض محمد اور اس کے بال بچوں نے میرے لئے اپنے گھر کے دروازے کھول دیئے۔ وہی قدیم طرز کا مکان، اونچی چھتوں والے بڑے بڑے کمرے، رنگین شیشوں والے روشن دان، بڑا سا دالان جس سے ملا ہوا باورچی خانہ جس میں فرش پر بیٹھ کر کھانا پکاتی فیض کی بیوی کا وہ انہماک سے گرم گرم چپاتیاں اتارنا ہمیشہ یاد رہے گا۔ فیض محمد کے تین بیٹے تو ذرا الگ الگ رہے لیکن دو بیٹیوں نے مجھے ویسے ہی چاہا جیسے بیٹیاں چاہتی ہیں۔ رات کو صحن میں بستر لگ جاتے اور پانچوں بچے میرے گرد حلقہ کر لیتے اور مجھ سے پرانی روڑکی کے قصے کہانیاں سنتے۔ انہیں معلوم بھی نہ تھا کہ روڑکی میں رات کے وقت بہت جگنو چمکتے تھے اور ہم تالی بجا بجا کے انہیں گرایا کرتے تھے اور یہ کہ بارش کے بعد گھاس سے سرخ مخمل جیسی بیر بہوٹیاں نکلتی تھیں۔ پھر یہ ہوا کہ روڑکی میں میرے ملنے اور جاننے والوں کو میرے آنے کی خبر ہوئی تو وہ سارے ہی ملاقات کے لئے آنے لگے۔ غلام صابر اور ننھو کو پینتیس سال بعد دیکھا۔ پھر یونس حلوائی اپنی ضعیفی کے باوجود چلے آئے۔ خوب رونق لگی اور پرانی باتیں دہرائی گئیں تو پتہ چلا کہ میری یادیں سب سے زیادہ تازہ تھیں۔

ابھی نو دس سال ہوئے، فیض محمد کے دماغ کی رگ پھٹی اور وہ چل بسا۔ علی گڑھ سے کئی طرح کا طب پڑھ کر آیا تھا لیکن خود اپنی صحت کا خیال نہ رکھ سکا۔ مجھے یاد ہے، مجھے کبھی کھانسی ہوتی تو ابّا سے کچھ پیسے لے کر اور پہاڑی بازار جا کر حکیم صاحب کو سکّہ دے کر کہتا کہ مجھ کھانسی کی گولیاں دے دیجے۔ وہ سکّے کو غور سے دیکھتے اور اسی حساب سے گولیوں کی پڑیا باندہ دیتے۔ اس بازار میں بہت سے عطّار بیٹھتے تھے، اصولاً انہیں عطر بیچنا چاہئے تھا لیکن وہ سب طبیبوں کے لکھے ہوئے نسخے باندھا کرتے تھے۔ ان کی باندھی ہوئی پڑیا کا کمال یہ تھا کہ آسانی سے نہیں کھلتی تھی اور دوا کے بکھر جانے کا امکان نہیں تھا۔ الماریوں میں چنے ان کے وہ ڈبے یاد ہیں، ہر ڈبے پر کسی جڑی بوٹی کا نام لکھا ہوتا تھا۔ ان ناموں کا علم سب سے الگ ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر جہاں تخم بادیان لکھا ہوتا، اس کے اندر سونف ہوتی تھی۔ سونف کو سونف کہنا حکمت کی شان کے خلاف تھا۔ وہیں کہیں لعوقِ سپستاں بھی لکھا ہوتا۔ نہیں معلوم اس کے اندر کیا ہوتا تھا البتہ دوا کے اس نام کا رعب بہت تھا۔

فیض محمد کے بعد حکیم صاحب کے پوتے صفدر اعظم خاں نے دیسی اور ولایتی، ہر قسم کی دواؤں کا اچھا سجا دھجا اسٹور کھولا ہے جس میں دوسرا بیٹا شکیل ہاتھ بٹاتا ہے۔ یوں بھی کہ صفدر اعظم خیر سے شاعر نکلے اور شہرت پا گئے۔ سنا ہے نہ صرف ہندوستان کے اندر بلکہ ملک سے باہر بھی مشاعرے پڑھنے کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ فیض کا ایک اور بیٹا مسعود قانون داں ہے۔ بڑی بیٹی شگفتہ بیاہ کر ریاض چلی گئی ہے اور ایک پبلک اسکول میں پڑھاتی ہے۔ چھوٹی لڑکی حنا نے، جسے میں پیار سے چھوٹا بیٹا کہتا تھا، اعلیٰ تعلیم پائی ہے اور ایک منجمنٹ کالج میں پڑھاتی ہے (جن دنوں یہ سب تحریر ہو رہا ہے، خیر سے اس کی شادی کی تیاری ہو رہی ہے اور اسے بیاہ کر علی گڑھ

جانا ہے)۔اولاد کے بارے میں اتنی اچھی خبریں سن کر مجھے تو یوں لگے ہے کہ روڑ کی کی فضاؤں میں جگنواب بھی چمک رہے ہیں اور فیض محمد کہیں عالمِ بالا میں تر کی ٹوپی اوڑھے اور اونچا نیکر پہنے، مسرور ہے۔

نھو کا زمانہ

حسینی بوا گھر کے کام کاج کرنے آتیں تو ان کے ساتھ نھو بھی آتا۔اس کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی اور دوسری بات جو ہم لوگوں کو عجب لگتی تھی وہ یہ کہ حسینی بوا کو نھو کو پڑھانے لکھانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کچھ بھی ہو، نھو سے میری بہت دوستی تھی۔ یوں سمجھئے کہ سڑکوں پر ہم دونوں مل کر لکڑی کی مدد سے پہیہ دوڑاتے تھے۔ میں بھی اُسی جتنا تھا، پھر میرا نام نھو کیوں نہیں، میں اکیلے میں یہ بات سوچا کرتا تھا۔اس کی ماں شہر کے امام باڑے کے پچھواڑے ایک بوسیدہ سے مکان میں رہتی تھی۔ایسے مکانوں میں بس غریب رہا کرتے ہیں۔ وہ بھی غریب ہوگی اسی لئے اپنے بیٹے کو اسکول نہیں بھیجتی تھی۔نھو سارا دن بیکار گھومتا اور ہم لوگوں کے اسکول سے آنے کا انتظار کرتا۔اس کے اسکول نہ جانے کا ہمیں بہت دکھ تھا۔اسکول میں جس دن علم کا عالمی دن منایا جاتا اور بچوں سے کہا جاتا کہ کم سے کم ایک آدمی کو پڑھنا لکھنا سکھاؤ، اس روز گھر میں نھو ہی کی کلاس لی جاتی مگر وہی کلاس کا پہلا اور وہی آخری دن ہوتا۔ ہم سب بچے اس سے پوچھا کرتے کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے۔وہ لکڑی کی جس موٹر گاڑی میں دھاگا باندھ کر چلاتا تھا اس کی طرف اشارہ کرکے کہتا کہ میں موٹر چلاؤں گا۔نھو بڑا ہی کھلنڈرا تھا، درختوں پر بندر کی طرح چڑھ جاتا، نہر کے پل پر سے پانی میں کود جاتا اور ڈوبتا بھی نہیں تھا۔اکثر کھانستا رہتا اور درخت پر چڑھ کر گولر کھاتا جسے کاٹیں تو اس میں چھوٹے

چھوٹے بھنگے رینگ رہے ہوتے۔ وہ انہیں جھٹ منہ میں رکھ لیتا اور کہتا کہ یہ کھانسی کا بہترین علاج ہے۔ یہ وہ دن تھے جب ہم بچے بڑے ہو رہے تھے۔ نھو ذرا بڑا ہوا تو میرے بھائی مصطفیٰ علی نے سے اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ بھائی ریڈیو انجینئر تھے اور ان کے گانے بجانے کا ساؤنڈ سسٹم کرائے پر چلا کرتا تھا۔ گاؤں دیہات والے اپنی شادی بیاہ کی تقریب میں لاؤڈ اسپیکر پر گانے بجوایا کرتے تھے۔ نھو یہ سارا تام جھام لے کر جاتا اور براتیوں کا دل بہلاتا۔ محرم بڑی باقاعدگی سے مناتا۔ مجلسوں اور تعزیے کے جلوس میں ماتم ضرور کرتا۔ پھر یہ ہوا کہ ہمارا سارا گھرانا روڑکی چھوڑ کر پاکستان کو سدھار گیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام ہمجولیوں سے کوئی تعلق نہ رہا۔ جب بہت عرصے بعد میرا روڑکی جانا ہوا تو سارے ہی جاننے والے مجھ سے ملنے آئے۔ ان میں آدھی سفید، آدھی کالی ڈاڑھی والا نھو بھی تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بھینچ کر گلے لگایا۔ میں نے پوچھا 'نھو کیا کرتے ہو؟' اس کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ کہنے لگا 'پنجاب سے بنگال تک مال بردار ٹرک چلاتا ہوں۔ میں نے پوچھا۔ 'کیا وہی آگے دھاگا باندھ کر؟'۔ سب مل کر ہنسے۔ نھو بھاری بھرکم سامان ڈھوڈھو کر وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا تھا۔ پھر وہی ہوا، وقت ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا۔ میں نے روڑکی میں یونس حلوائی کے پوتے محمود میاں کو پیغام بھیج کر پوچھا کہ نھو کی کیا خبر ہے۔ انہوں نے لکھا۔ 'ہاں، ہم سب انہیں میر صاحب کہتے تھے'۔ میں نے پوچھا 'پھر کیا ہوا'۔ محمود نے روڑکی کے لہجے میں اور رومن حروف میں جواب لکھا۔ 'ایک سال ہوا، نھو صاحب گجر گئے'۔

سچ تو یہ ہے کہ اس عرصے میں ایک نھو ہی کیا، بہت کچھ 'گُجر' گیا۔

میں نے کتاب کے اس حصے کو 'نھو کا زمانہ' کا عنوان دیا ہے۔ اس کا سبب

ہے۔ان دنوں ہم لڑکے بڑے ہو رہے تھے۔ننھو بڑے بھائی کے کام میں ہاتھ بٹانے لگا اور میں خالی وقت میں ابّا کے ساتھ دکان میں بیٹھنے لگا۔ جنگ کا زمانہ تھا، خوش حالی تھی اور دکان میں گراموفون ریکارڈوں کی اچھی فروخت ہو رہی تھی۔ میں کلکتے سے آنے والے پارسل کھولنے میں اور تازہ آئے ہوئے ریکارڈوں کو خانوں میں لگانے کے کام میں ہاتھ بٹانے لگا۔ابّا نے ایک رجسٹر بنا رکھا تھا جس میں وہ ہر گانے کے بول لکھتے اور ریکارڈ کس خانے میں رکھا ہے، اس خانے کا نمبر درج کرتے۔ وہ زمانہ تھا جب انجینئرنگ کالج کے نہایت اسمارٹ لڑکے، جو اپنے گھر والوں اور خاص طور پر محبوباؤں کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے ہوں گے، وہ سب شاموں کو پنکج ملک، ہیمنت کمار اور جگ موہن کے گیتوں کے نہایت رومانٹک گانے خریدنے ہماری دکان پر آتے۔ایک روز ایک گاہک نے کسی گیت کا ریکارڈ مانگا، ابّا اپنے رجسٹر میں وہ گیت ڈھونڈنے چلے ہی تھے کہ میں نے کہا۔'یہ راتیں، یہ موسم، بیس نمبر خانے میں رکھا ہے'۔ پھر تو اپنی ذہانت پر میں خود حیران ہوا۔ایک روز ایک خوش پوشاک، خوش حال گاہک آیا اور اس نے ابّا سے کہا کہ اپنی پسند کے چھ بہت اچھے گانے دے دیجیے۔ میں چھوٹا سا لڑکا وہیں موجود تھا۔ابّا نے چشمے کے اوپر سے مجھے دیکھا۔میں نے جھٹ چھ ریکارڈ نکالے اور گاہک کو سنا دیئے۔ وہ تو خوشی سے جھوم اٹھا اور بڑا شکریہ ادا کرتا ہوا چلا گیا۔کچھ عرصے بعد وہی گاہک دوبارہ آیا اور ابا سے کہا کہ اپنے بیٹے سے کہیئے کہ اپنی پسند کے چھ ریکارڈ نکال دے۔ایک بار ایک انگریز میاں بیوی دکان پر آئے اور ابا سے کہا کہ کوئی ہندوستانی ریکارڈ دے دیجیے۔ابا نے میری طرف دیکھا۔ان ہی دنوں زہرہ بائی انبالے والی کا ایک لچر سا ریکارڈ آیا جس کے بول تھے۔''مائی ڈیئر، آئی لو یو۔ بول کہاں ہے تو''۔میاں بیوی وہ ریکارڈ سینے سے لگا کر لے گئے جیسے کوئی بہت بڑی

سوغات ہو۔ وہی دن تھے جب کچھ گانے بہت مقبول ہو رہے تھے۔ فلم زینت میں عورتوں کی قوالی کی دھوم تھی۔ فلم پہلی نظر میں مکیش کی آواز میں وہ گانا آیا۔ 'دل جلتا ہے تو جلنے دے'۔ اس میں مکیش نے سہگل جیسی آواز نکالی تھی۔ گاہک بھی سہگل صاحب کے گانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ ہز ماسٹرز وائس والے بھی اتنے بدمعاش تھے کہ ریکارڈ کے پہلے ایڈیشن پر گانے والے کا نام نہیں لکھا تھا۔ پھر ڈبلیو زیڈ احمد کی فلم من کی جیت کے گانے آئے۔ ابّا کو کان پور والی ستارہ کا وہ گانا بہت پسند تھا۔ 'اے چاند نہ اترانا'۔ خود بھی سنتے تھے اور ہر شام آ کر بیٹھنے والے اپنے ہم عمر دوستوں کو بھی سناتے تھے کہ اس میں جوش ملیح آبادی نے شاعری کے کیسے کمالات دکھائے ہیں۔ ان ہی دنوں فلم درد کا اوما دیوی کا گانا مقبول ہوا۔ 'افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا'۔ اور ہمارے چلتے چلتے لتا منگیشکر نمودار ہوئیں اور فلم برسات میں ان کے گانے نے دھوم مچائی۔ 'ہوا میں اڑتا جائے مورا لال دوپٹہ ململ کا'۔

مگر ابّا اچھے دکان دار نہیں تھے۔ شہر میں میر صاحب کا غصّہ مشہور تھا۔ گاہکوں کو ڈانٹ دیا کرتے تھے۔ کبھی کچھ لوگ ریکارڈ خریدنے آتے، کئی ریکارڈ نکلوا کر سنتے اور خریدے بغیر جانے لگتے تو ان پر غضب کی ڈانٹ پڑتی۔ اس زمانے میں ہز ماسٹرز وائس یا کولمبیا کا ریکارڈ ساڑھے چار روپے کا آتا تھا جو اُس وقت بڑی رقم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی شامت کا مارا گاہک ریکارڈ خرید کے لے جاتا اور دوسرے تیسرے دن وہی ریکارڈ واپس کرنے آجاتا، اس پر ایسی ڈانٹ پڑتی کہ پھر کبھی دکان کے سامنے سے بھی نہ گزرتا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ابّا نے دکان بڑے شوق سے قائم کی تھی۔ گراموفون کمپنی والے کبھی کبھی دکان اور اسے چلانے کا نظام دیکھنے آتے تھے اور کوئی مشہور فن کار روڑکی آرہا ہوتا تو اس سے کہا جاتا کہ میر صاحب کی دکان پر ضرور

جائے۔ ایک بار دھوم مچی کہ مشہور قوال عظیم پریم راگی روڑ کی آنے والے ہیں۔ ان کی ایک قوالی 'سکھی ری ڈولی میں ہو جا سوار' بہت مقبول ہو رہی تھی۔ ان کی اور بھی قوالیوں میں سارا کا سارا نعتیہ کلام ہوتا اور اس کے احترام کی خاطر ان کی ریکارڈ بھروانے کی شرط یہ تھی کہ ریکارڈ پر کتّے کی تصویر نہ ہونی چاہئے، ان کی شرط مانتے ہوئے ریکارڈ بنانے والوں نے ان کے لئے ایک الگ کمپنی کھول دی۔ ان کے ہر ریکارڈ پر ڈاک کے ٹکٹ کے برابر خود عظیم پریم راگی کی تصویر ہوا کرتی تھی۔ مجھے سب یاد ہے۔

دو ایک باتیں ایسی ہیں جو مجھے یاد نہیں، جو میری باجیوں نے مجھے بتائیں۔ گانوں سے میرا لگاؤ دیکھ کر بہنیں بہت ہنسا کرتی تھیں اور کہتی تھیں کے ریکارڈ کے گانے تمہاری گھُٹّی میں پڑے ہیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تو وہ بتاتیں کہ تمام بھائیوں کی طرح میں بھی گھر پر ہی پیدا ہوا۔ زچہ خانے میں گراموفون رکھا تھا۔ مری ولادت ہوئی اور مجھے امّاں کے دودھ پر لگا دیا گیا۔ اسی لمحے کسی نے گراموفون پر ریکارڈ لگا دیا۔ باجی بتاتی ہیں کہ میں نے دودھ چھوڑ کر اور پلٹ کے ادھر دیکھا جدھر سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ میرے بھائی ہنسا کرتے تھے کہ میرے کان میں اذان سے پہلے گانا پڑا تھا۔ خیر، میں بھائی مرتضیٰ علی سے بہتر رہا جن کی پیدائش پر کہا گیا کہ کوئی بچے کے کان میں اذان دے۔ اس پر بھائی سرور علی نے ان کے کان میں منہ لگا کر کہا 'ککڑوں کوں' اور وہ بھی توتلی زبان میں۔ یہی بھائی میرے توتلے پن پر میرا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ مجھ سے کہتے 'کہو کوکا'۔ میں کہتا 'توتا'۔ پھر کہتے۔ 'کہو توتا' میں دوبارہ کہتا 'توتا'۔ وہ خوب ہنستے اور کہتے کہ کوکا بھی توتا اور توتا بھی توتا۔ میں جھینپ کر رہ جاتا۔ صبح جب سب منہ دھوتے، میں اپنا گیلا چہرہ تولئے سے رگڑ کر خشک کرتا تو بڑے بھائی کہتے کہ تولیا منہ خشک کرنے کے لئے ہوتا ہے، رگڑنے کے لئے نہیں۔ میرے

اور بڑے بھائیوں کے تعلقات عجیب سے تھے۔ میرا خیال ہے میں روتا بہت تھا جس پر وہ چڑتے تھے۔ ایک بار بڑے بھائی کان پور سے روڑکی آئے اور مجھے بار بار روتا دیکھ کر انہوں نے کہا کہ جس دن تم نہیں روؤ گے، تمہیں ایک پیسہ ملے گا۔ مجھے یاد ہے اس کے بعد میں اپنا رونا روکنے کے لئے اپنے اوپر کتنا جبر کرتا تھا اور اگر کبھی کسی طرح رونا آ جاتا تو خوشامد کرتا کہ بھائی کو نہ بتانا۔ اس وقت ایک پیسہ کتنا قیمتی ہوتا تھا، یوں سمجھ لیجئے کہ ایک پیسے میں پتہ بھر کر اندھے کے چھولے ملتے تھے۔ وہی جن کے اوپر کمال کا مصالہ چھڑکا ہوتا تھا اور کھانے کے لئے پتے کا چھوٹا ٹکڑا رکھا ہوتا تھا، چمچے کے بجائے۔ (آج یہ لکھا اور منہ بھر کر اپنا ہی ایک گھونٹ پیا)۔

میرے سفر، نگر نگر

نوعمری کیا ہے؟ ایک کمسن لڑکا ہے جو میری انگلی نہیں چھوڑتا، ساتھ چلنے سے باز نہیں آتا۔ چہرہ اٹھائے مسلسل میرے منہ کو تکے جاتا ہے کہ کہیں میں اس سے تنگ تو نہیں آ گیا۔ اب اُسے کیسے یقین دلاؤں کہ میرا بس چلے تو چاندی کی ایک ڈبیا بنواؤں، اسے احتیاط سے اٹھاؤں اور چمکتی دمکتی ڈبیا میں محفوظ کرلوں۔ اس کی جو ادائیں میرے ذہن سے کسی حال محو نہیں ہوتیں ان میں وہ چھوٹے چھوٹے سفر شامل ہیں جو میں نے لڑکپن میں کئے۔ میرے بہنوئی تحصیل دار تھے اور میرے ضلع سہارن پور کی مختلف تحصیلوں میں تعینات ہوتے تھے۔ ہمارا کنبہ اکثر ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ یہ جن دنوں کی بات ہے وہ تاریخی شہر دیوبند میں متعین تھے۔ آزادی میں ابھی دو تین برس باقی تھے۔ دیوبند جانے والا وہاں دارالعلوم کو کیسے بھول سکتا ہے۔ عظیم الشان عمارتیں دیکھنے میں بھی گیا اور ہزارہا طلبہ کو دیکھ کر میں نے حیرت سے کہا تھا: اتنے سارے مسلمان؟ دیوبند یقیناً قدیم شہر ہے۔ میں نے وہاں مغلوں کے دور کے اناج کے ذخیرے دیکھے جنہیں لوگ کھتّی کہتے تھے۔ ایک قدیم امام بارگاہ دیکھی تھی جو اب بھی قائم ہے۔ ان ہی دنوں ناچ گانے والوں کا ایک طائفہ دیوبند آیا ہوا تھا۔ مجھے یاد

ہے اس میں اداکارہ آشا پوسلے بھی شامل تھیں۔ بہت عرصے بعد پاکستان میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کو ان کا دیوبند جانا یاد تھا۔ بہت خوش ہوئیں کہ انہیں بھی دیوبند میں شو کرنا یاد تھا۔ یوں ان دنوں شہر بے رونق سا تھا۔

ہمارے دیوبند جانے کا سبب دل چسپ تھا۔ ہوا یہ کہ کانپور میں ہماری ایک ماموں زاد بہن کے شوہر لاپتہ ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ وہ ایک حادثے میں مر گئے اور لاوارث سمجھ کر کہیں دفن کر دیئے گئے۔ کسی نے کہا کہ زندہ ہیں اور کہیں دیکھے گئے ہیں۔ ہماری بہن کو کسی نے بتایا کہ دیوبند میں ایک پنڈت جی ہیں جو آپ سے بات کئے اور کچھ پوچھے بغیر آپ کا مسئلہ بھی بتا سکتے ہیں اور اس مسئلے کا حل بھی بتاتے ہیں۔ اُن سے ملنے ہم سب دیوبند گئے۔ انہیں بلایا گیا۔ ہماری بہن پردے میں بیٹھیں۔ پنڈت جی نے ایک بڑے سے کاغذ پر کچھ پڑھا اور وہ کاغذ ایک بند کمرے میں رکھ دیا گیا۔ باہر پنڈت جی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے رہے۔ کچھ دیر بعد کمرہ کھول کر وہ کاغذ نکال کر فرش پر پھیلایا گیا اور اس کے اوپر بہت سا پانی پھینکا گیا۔ کاغذ پر حروف نظر آئے۔ لکھا تھا کہ تمہارے شوہر لاپتہ ہیں۔ اس کے بعد لکھا تھا کہ وہ زندہ ہیں اور تمہیں مل جائیں گے۔ مسئلہ صحیح تھا لیکن اس کا حل بتاتے ہوئے پنڈت جی کے سارے منتر ہار گئے۔ ہمارے بہنوئی کبھی واپس نہیں آئے۔

جوگی پورہ

ہوا یہ کہ جب ابّا نے اعلان کیا کہ دو تین دن بعد سارا کنبہ ریل گاڑی سے جوگی پورہ چلے گا تو ایک عجب بات ہوئی۔ میری بھوک اُڑ گئی۔ یوں لگا جیسے معدے میں پتھر رکھا ہے۔ برسوں بعد اندازہ ہوا کہ ریل گاڑی کے اشتیاق نے نہ صرف میری

بھوک بلکہ نیندیں بھی اڑادی ہیں۔کوئی سوچے کہ ایسے میں جب بستر بند باندھے جارہے تھے،کوئی اندازہ لگائے کہ جب راستے کے لئے آلو کی بھجیا پک رہی تھی اور پوریاں تلی جارہی تھیں تو ایک دس گیارہ برس کے لڑکے کی سفر کے تصور سے کیا حالت ہوئی ہوگی،اور وہ بھی ریل گاڑی کا سفر۔اس کے بعد جب چلتی ریل گاڑی میں ناشتے دان کھولے جارہے تھے تو کئی روز سے دَم سادھے بھوک کس شدّت سے چمکی ہوگی۔ روڑکی سے ہم سب کو نجیب آباد جانا تھا۔وہ زیادہ دور نہیں تھا مگر جی چاہا کہ وہ دور سرک جائے۔ نجیب آباد کے اسٹیشن سے باہر نکلے تو سامنے سوزوکیاں، ٹیکسیاں اور بسیں نہیں، بیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔دوبیل گاڑیوں کے بھاؤ تاؤ ہوئے اور سارے کے سارے سوار ہوکر وہ جگہ دیکھنے چلے جہاں کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ کسی زمانے میں حضرت علی آئے تھے۔

اب بیل گاڑیاں اپنی مخصوص چال چلتی ہوئی، کھیتوں اور دیہات کے درمیان اس کچی سڑک پر دوڑنے لگیں جس کے بارے میں کسی نے بتایا تھا کہ راستے میں سلطانا ڈاکو کا قلعہ پڑتا ہے اور وہ نالہ آتا ہے جس پر کوئی پُل نہیں۔وہ سب آئے۔ میں چھوٹا تھا اس لئے قلعہ بہت بڑا اور نالہ بہت گہرا لگا۔انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے ہم اچانک آم کے باغوں میں داخل ہوئے جہاں امریّوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بے شمار قبریں بنی تھیں۔کسی نے کہا جوگی پورہ آ گیا۔ ذرا آگے چل کر واقعی جوگی پورہ آ گیا۔ چھوٹی سی بستی تھی۔ایک خوش نما عمارت میں زیارت گاہ تھی جس کے سامنے زائرین کے قیام کے لئے بہت سے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ہمیں دو کوارٹر مل گئے لیکن ہم زیارت گاہ دیکھنے اور وہ قصہ سننے کے مشتاق تھے جس کی وجہ سے یہ جگہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں چھوٹی سی آبادی ہوا کرتی تھی جس کے باشندے حضرت علی کو بہت

مانتے تھے۔ ایک رات وہاں لوگوں نے ایک گھڑ سوار کو دیکھا جس نے پینے کے لئے پانی مانگا۔ لوگ جب تک پانی لے کر آئے وہ سوار واپس جا رہا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ سوار نے چلتے ہوئے کہا: علی۔ اب تو ساری بستی میں دھوم مچ گئی۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ شیرِ خدا حضرت علی تھے۔ وہ تو چلے گئے البتہ خاک پر گھوڑے کے سموں کے نشان اور اس کے منہ کا جھاگ موجود تھا۔ لوگوں نے وہ خاک اکٹھا کر کے ایک برتن میں بند کر دی۔ اب وہ برتن وہاں دفن ہے۔ زائرین اس کے اوپر بہہ کر آنے والا پانی ساتھ لے جاتے ہیں جو انہیں یقین ہے اکسیر کا اثر رکھتا ہے۔ میرے سفر کا یہ قصہ کوئی ستّر سال پرانا ہوا۔ اب تو جوگی پورہ پچھ کا کچھ ہو چکا ہے۔ اس کا نام نجفِ ہند پڑ گیا ہے اور وہاں ہر شہید کربلا کی ضریح رکھی ہے۔ اس کے علاوہ معجزے کے قصے میں نئی نئی کہانیاں اور نئے کردار شامل ہو گئے ہیں۔ ہر سال لاکھوں عقیدت مند آتے ہیں۔ یقین ہے اب پکی سڑکیں بن گئی ہوں گی، موٹر گاڑیاں دوڑ رہی ہوں گی۔ نالے پر پُل بن گیا ہوگا البتہ سلطانا ڈاکو کا قلعہ جوں کا توں کھڑا ہوگا۔

خورجہ

خورجہ بڑا تاریخی شہر تھا جو وقت کی گرد میں دب گیا۔ میرے بہنوئی کا آبائی گھر خورجے میں تھا۔ ان کے ساتھ مجھے دو تین بار وہاں جانے کا موقع ملا۔ یہ بات پرانی ہوئی۔ پھر یہ ہوا کہ طویل عرصے بعد ایک بار وہاں سے گزر رہا تھا تو شہر پہچانا نہ گیا۔ بڑی خوبیوں کا علاقہ تھا، اس کو کسی کی نظر کھا گئی۔ لوگوں سے سبب پوچھا۔ جب کوئی کچھ نہ بتا سکا تو ایک بزرگ بولے۔ ’’اجی یہاں کے وہ ہنر مند مسلمان چلے گئے۔ اب تو یہاں کھرچن رہ گئی ہے‘‘۔ ان کی اس بات پر سب کے ساتھ میں بھی

ہنسا۔ پتہ چلا کہ خورجے میں اب نہ وہ گزک بنانے والے رہ گئے ہیں نہ وہ عرقِ گلاب بنانے والے جن کے لئے راتوں کو بیل گاڑیوں میں بھر کر کہیں سے گلاب لائے جاتے تھے۔ اب کچھ حلوائی رہ گئے ہیں جو دودھ سے ربڑی بناتے ہے جسے یہاں کھرچن کہا جاتا ہے۔ یہ پہلے کبھی جاٹوں کا علاقہ ہوا کرتا تھا۔ بعد میں اس پر پٹھانوں کا غلبہ ہوا۔ ان سب کے علاوہ یہ شہر کوزہ گروں کا شہر ہوا کرتا تھا۔ چاک پر ہزار طرح کے کوزے ڈھالنے والے کمہاروں کا شہر۔ جب میں پہلے پہلے خورجہ گیا، علاقے میں ظروف پکانے والی پانچ سو سے زیادہ بھٹیاں تھیں اور کئی ہزار کاری گر چاک پر سے بھانت بھانت کے برتن اتارا کرتے تھے۔۔ جیسے کبھی ہاپوڑ کے پاپڑ مشہور تھے بالکل اسی طرح خورجے کی گزک کی شہرت تھی۔ مسلمانوں کے محلّوں میں تِل اور گڑ یا شکر کو کوٹ کر بھربھرا بنانے کی مسلسل ضرب لگا کرتی تھی جس کا شور دور دور تک سنائی دیتا تھا۔ اتنی ملائم اور لذیذ گزک اب پاکستان کے بعض علاقوں میں ملتی ہے۔ یہی حال عرق گلاب کا تھا۔ سارے ہندوستان کو یہ عرق خورجے سے جاتا تھا۔۔ اب رہ گئے وہاں کے کمہار، ان کے بارے میں سو قصے مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ افغان بادشاہ تیمور لنگ کی فوجوں کے ساتھ جو کوزہ گر ہندوستان آئے تھے وہ ملتان، جے پور اور خورجے میں بس گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ خود کو ملتانی کمہار کہتے ہیں۔ ان کا ہنر ہو بہو ملتان کے کمہاروں جیسا ہے۔ شہر میں کوزہ گر ظہیر الدین کی بہت شہرت ہے۔ وہ چالیس سال سے یہ برتن بنا رہے ہیں اور خاندان کے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی یہ فن سکھا رہے ہیں۔ مگر کہتے ہے کہ اس فن کی قدر کم ہوتی جارہی ہے۔ بے شمار بھٹیوں کے دھوئیں اور گرد نے خورجے کی فضا بری طرح آلودہ کر دی تھی۔ وہ کارخانے بھی تیزی سے بند ہورہے ہیں۔ جن دنوں میں وہاں گیا، مسلمان بڑی تعداد میں آباد

تھے۔ مساجد تھیں، ایک بڑا امام باڑہ تھا۔ محرم کا بڑا جلوس نکلتا تھا جس کے تعزیوں کے گنبد پر سفید کپڑا منڈھا ہوتا تھا اور جس کے آگے شہنائی نواز نوحوں کی طرزیں بجاتے ہوئے چلتے تھے، بنارس کے بسم اللہ خاں کی طرح۔ خورجے کے پٹھانوں پر یاد آیا کہ سنہ سینتالیس کے پرآشوب دنوں میں میرے شہر روڑکی کے داروغہ محمد یعقوب خاں تھے جن کا تعلق خورجے سے تھا۔ ان کا بیٹا محمد احمد میرا ہم عمر اور ہم جماعت تھا۔ چونکہ کوتوالی ہمارے گھر کے پچھواڑے تھی، یعقوب صاحب کی وجہ سے ہم لوگوں کے حوصلے بلند تھے۔ پھر سب بچھڑ گئے اور عجب اتفاق ہوا کہ کچھ عرصے بعد ہم سب پاکستان کے شہر کراچی میں اکٹھے ہوئے مگر اب وہ پہلے جیسی بات نہ تھی۔ یعقوب صاحب چل بسے، محمد احمد اچھے زمانوں کا طالب علم تھا، سائنس داں ہو گیا اور اس کے بیٹے نئے زمانے میں پروان چڑھے تھے، تبلیغی ہو گئے۔

نرورا

نرورا، جس کا لوگوں نے نام بھی نہیں سنا ہوگا، میں نے دیکھا۔ عظیم دریائے گنگا کے کنارے گمنام سا شہر تھا۔ انگریزوں نے دریا پر بند باندھ کر اس کو شہرت عطا کی۔ اب تو وہاں ہندوستان کا بہت بڑا ایٹمی بجلی گھر توانائی کی دولت لٹا رہا ہے لیکن جب میں اپنی بڑی باجی کے ساتھ گیا تھا اور چھوٹا سا لڑکا تھا، اتنا بڑا ہیڈ ورکس دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ باجی کو خاندان کے کچھ معاملات سلجھانے کے لئے وہاں بڑے بھائی جان کے پاس بھیجا گیا تھا جو نرورا ہیڈ ورکس کے چیف انجینئر تھے۔ باجی کا اکیلا جانا مناسب نہ تھا، ان کے ساتھ کوئی مرد ہونا چاہیئے تھا، سو میرا انتخاب ہوا (ذرا سوچیے میں ٹرین کے زنانہ ڈبے میں گیا تھا)۔ ریل گاڑی کا سفر طے کر کے ہم کسی اسٹیشن پر،

شاید علی گڑھ پر اترے۔ رات ہو چلی تھی۔ وہاں سے جہاں تک مجھے یاد ہے، ٹرام جیسی کسی سواری سے ہم نرورا گئے تھے۔ میں اونگھتا ہوا بھائی جان کے بنگلے پر پہنچا جو اونچائی پر بنا ہوا تھا اور جہاں سے دریا اور بیراج صاف نظر آتا تھا۔ صبح سب جاگے تو میں اپنی بھتیجیوں سے ملا۔ باہر نکل کر گنگا کی تازہ ہوا اپنے وجود میں اتاری اور دریا کا وہ قصہ سنا جس نے علاقے میں خوف پھیلا رکھا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ دریا میں ایک بڑا گھڑیال آ گیا ہے جو نہانے اور کپڑے دھونے والوں کو ایک جھپٹا مار کر کھا جاتا ہے۔ اس کی دہشت سے لوگوں نے، خاص طور پر عورتوں نے دریا میں نہانا چھوڑ دیا تھا بلکہ ہمیں ہدایت تھی کہ پانی کے قریب نہ جائیں۔ ہم سب شام کو دریا کی سیر کے لئے جاتے اور ایک اونچے چبوترے سے دریا کا بہاؤ دیکھا کرتے تھے۔ ایک عجیب بات تھی کہ روز دریا میں کچھ نہ کچھ بہتا نظر آتا تھا۔ ایک شام میں وہاں کھڑا کہہ رہا تھا کہ کبھی کوئی انسان کی لاش نظر نہیں آئی۔ میرا یہ کہنا تھا کہ سامنے سے ایک لاش بہتی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر سب ایک ساتھ بولے 'عورت ہے، عورت ہے'۔ انہوں نے جلد ہی وضاحت کر دی۔ مرد کی لاش چت ہوتی ہے، عورت کی لاش کی صرف پیٹھ نظر آتی ہے۔

یہ قصے چل رہے تھے کہ ایک صبح گھڑیال گھڑیال کا شور مچا۔ بھائی جان کے اردلی دوڑے ہوئے آئے اور ان کی بڑی سی دونالی بندوق اور بڑے بڑے کارتوس لے گئے۔ کچھ دیر بعد گولی چلنے کی آواز آئی۔ پھر لوگوں کا شور سنائی دیا، فاتحانہ شور۔ گھڑیال مارا گیا، پھر تو علاقے میں جشن کا سماں تھا۔ کچھ دیر بعد ایک بیل گاڑی پر مردہ گھڑیال لایا گیا، اس کا جبڑا گاڑی بان کے پہلو میں رکھا تھا اور اس کی دم پیچھے گھسٹتی ہوئی آ رہی تھی۔ علاقے کی پوری آبادی اسے دیکھنے آئی۔ کچھ دیر بعد چمار اس کی کھال اتارنے آ گئے۔ پتہ چلا کہ کھال کے سوٹ کیس بنیں گے۔

اب ہماری واپسی کا مرحلہ تھا۔ ہم ٹرین میں سوار ہوئے۔ میں کمسن تھا اس لئے عورتوں ہی کے ڈبے میں باجی کے ساتھ بٹھالیا گیا لیکن وہاں کچھ سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ ہو گیا تھا۔ نہیں معلوم کون آ گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ایک کمسن لڑکی کو خدا جانے کون زنانہ ڈبے میں بٹھا کر چلا گیا۔ عورتیں سخت پریشان تھیں کہ یہ بچی کون ہے، کہاں جائے گی اور اس کا کیا بنے گا؟ ہر سوال اپنا جواب مانگتا ہے۔ لیجئے وہ بھی سنئے۔

ایک اجنبی لڑکی، حمیدہ

کمپارٹمنٹ ہر قسم کی خواتین سے بھرا ہوا تھا۔ یوں لگا کہ وہ ساری کی ساری کوئی بڑی رازداری کی بات کر رہی تھیں۔ ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ عورتوں نے باجی کو سارا قصہ ایک ہی سانس میں سنا دیا۔ یہ دیکھو، چھوٹی سے لڑکی کو کوئی گاڑی میں بٹھا کر خود اتر گیا ہے۔ اس غریب بچی کو نہ اپنا نام پتہ معلوم ہے، نہ اپنے ماں باپ کی خبر ہے۔ سمٹی بیٹھی ہے، گم سُم۔ اب اس کا کیا ہوگا۔ خواتین یہ سب کہتی جاتی تھیں اور اپنے اپنے اسٹیشن پر اترتی جاتی تھیں۔ باجی اب تک خاموش تھیں اور گہری سوچ میں تھیں۔ جب بہت سی عورتیں اس مسئلے کا کوئی حل بتائے بغیر اتر گئیں تو باجی نے اعلان کیا جو ہمارے گھرانے کی سرشت میں ہے۔ انہوں نے کہا: اس لڑکی کو ہم لے جائیں گے اور جب تک اس کے ماں باپ کا پتہ نہیں چلتا، اس کو ہم پالیں گے۔ اس پر خواتین یوں مطمئن ہو گئیں جیسے ان کے سر سے بڑا بوجھ اتر گیا۔

کافی رات ہو گئی تھی جب ہماری گاڑی روڑکی پہنچی، میرے بڑے بھائی ہمیں لینے پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر آئے تھے۔ باجی لڑکی کی انگلی پکڑ کر نیچے اتریں اور بھائیوں کو جلدی جلدی سارا قصہ سنایا۔ لڑکی کے پاس کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ بڑے بھائی

نے مجھے گود میں اٹھالیا اور اپنا ٹکٹ دکھا کر تیزی سے باہر نکل گئے۔ لڑکی کو باہر لے جانے کے لئے میرا آدھا ٹکٹ دکھا کر کام چلایا گیا۔ ہم لوگ تانگے پر بیٹھ کر اپنی گلی میں پہنچ گئے جس کی آبادی میں یک لخت ایک کا اضافہ ہو رہا تھا۔

لڑکی کا کیا ہوگا، سارا گھر سر جوڑ کر بیٹھا۔ اس سے پیار کے ساتھ کتنے ہی سوال پوچھے گئے، اسے کسی کا جواب معلوم نہ تھا۔ سب سے پہلے اس کا نام حمیدہ رکھا گیا جس کے بعد ایک چھوٹی چارپائی پر بستر لگا کر لٹا دیا گیا۔ ذرا دیر بعد اس کا سر تکیئے میں دھنس گیا۔ خدا جانے کتنے عرصے بعد وہ چین سے سوئی۔ اب حمیدہ گھر کے ایک فرد کی طرح رہنے لگی۔ اس کی گھر گرہستی کی تربیت ہونے لگی۔ پڑھانے کی کوشش کی گئی جس میں سراسر ناکامی ہوئی۔ وہ بھی خود کو گھر کا فرد سمجھنے لگی اور روزہ نماز اور مجلس ماتم میں شریک ہونے لگی۔ وقت نے حمیدہ کے معاملے میں تیزی دکھائی۔ وہ دیکھتے دیکھتے جوان ہوگئی۔ ابّا ترک وطن کر کے پاکستان جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس دوران سہارن پور سے حمیدہ کا رشتہ آیا۔ ابّا نے جھٹ ہاں کر دی۔ حمیدہ کا نکاح ہونے لگا تو اس کے والد کا نام پوچھا گیا۔ جواب ملا کہ وہ تو معلوم نہیں، مولانا نے بتایا کہ ایسی صورت میں باپ کا نام عبداللہ لکھا جاتا ہے۔ وہ لکھا گیا اور حمیدہ بیاہ کر پڑوسی شہر سہارن پور چلی گئی اس دوران ملک کو آزادی ملی جس کے ساتھ ہی زمانے کو قتل و غارت گری کی آزادی بھی مل گی۔ حمیدہ کا شوہر فرقہ وارانہ فسادات میں مارا گیا۔ پھر خبر ملی کہ علاقے کے ایک جوان نے اس سے شادی کر لی۔ ہم لوگ مطمئن ہو کر، اپنی گلی چھوڑ کر پاکستان کو سدھار گئے۔ پھر حمیدہ سے ہمارا رابطہ نہ ہوا۔ میں ۳۵ سال بعد روڑکی گیا تو میرے دوستوں نے بتایا کہ حمیدہ ہریانہ میں کہیں اپنے فوجی بیٹے کے ساتھ رہتی ہے اور سال کے سال ابّا کے نام کی مجلس کرنے روڑکی آتی ہے۔ ایک دو بار

اس کے بیٹے کا لندن میں میرے پاس فون آیا۔ اس نے بتایا کہ حمیدہ چل بسی، اور وہ بھی بہت دکھ اٹھا کر۔

ہاپوڑ

یہ بڑا اذیّت ناک سفر تھا۔ ملک کو آزادی کیا ملی، لوگوں کو خوں ریزی اور بربادی مل گئی۔ روڑکی پر امن رہا مگر آس پاس کے علاقوں سے فسادات کی خبریں آنے لگیں۔ اس کے علاوہ ہم نے پاکستان کی طرف جاتی ہوئی بیل گاڑیاں دیکھیں جن پر مرد، عورتیں اور بچے سوار تھے اور مویشی پیچھے بندھے ہوئے، ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ آس پاس کے دیہات کے مسلمان باشندے پناہ کے خیال سے پاکستان کی طرف فرار ہو رہے تھے۔ میں ایک چھوٹا سا لڑکا، مجھے اس منظر کو قبول کرنے کے لئے بڑا سا جگر درکار تھا۔ گھر میں مشورے ہونے لگے۔ فیصلہ ہوا کہ ابّا اور ایک بڑے بھائی کے سوا سب کو ہاپوڑ بھیج دیا جائے جہاں ہمارے بہنوئی تحصیل دار تھے اور قلعے جیسی تحصیل کے احاطے میں رہتے تھے۔ چنانچہ ایک رات ہم سب کو ایک بس میں بٹھا کر ہاپوڑ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ہمیں پتہ تھا کہ وہاں سے ذرا دور ہندوؤں کے مقدس شہر گڑھ مکتیسر میں مسلمان بے دریغ مارے جا چکے تھے اور ہمارے بہنوئی کو ہندوؤں جیسا لباس پہن کر وہاں کا سرکاری دورہ کرنا پڑا تھا۔ جیسے جیسے ہماری بس اُس علاقے کی طرف بڑھتی گئی، فضا میں کشیدگی اور ہراس کی آثار نظر آنے لگے۔ علاقے میں فوج طلب کی جا چکی تھی۔ وہ اور پولیس سڑکوں پر گشت کر رہی تھی۔ آخر ایک جگہ ہماری بس روک لی گئی اور ہم سہمے ہوئے لوگ اندر بیٹھے باہر ہونے والی گفتگو سنتے رہے۔ سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ اس رات میں نے پہلی بار لفظ 'مچلکہ' سنا۔

شاید ہمارے نگراں سے کوئی وعدہ لے کر ہمیں چھوڑ دیا گیا۔ رات گھنی ہو چکی تھی جب ہماری بس تحصیل کے بڑے سے گیٹ سے گزر کر لمبے چوڑے احاطے میں داخل ہوئی۔ چونکہ وہاں سرکار کا خزانہ بھی تھا اس لئے چوبیس گھنٹے کی گارد بھی تھی۔ بس کو دیکھ کر خزانے کے محافظ نے چونکا دینے والی صدا لگائی جو انگریزی میں تھی: کون جا رہا ہے، دوست یا دشمن؟ ہمارے نگراں نے اسی رات کے اندھیرے میں جواب دیا۔ "تحصیل دار صاحب کے بچّے ہیں"۔ احاطے کے ایک کونے میں ہمارے دولہا بھائی کی قیام گاہ تھی جہاں ہماری باجی نے ہم سب کے بستر لگا رکھے تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھ کو اپنی زندگی کے اگلے ڈھائی تین برس یہاں ہاپوڑ میں گزارنے ہیں۔ مجھے یہ خبر بھی نہ تھی کہ ماں جیسی شفیق باجی، جنہیں ہم ابّی باجی کہتے تھے، مجھے بہت توجہ دے کر میری کردار سازی کریں گی۔ کچھ عرصے بعد جب ذرا سکون ہوا، روڑکی سے آئے ہوئے سب لوگ واپس چلے گئے اور میں ہاپوڑ کے گورنمنٹ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ میں تو نکلا تجسس کا مارا، موقع ملتے ہی شہر کی سیر کو نکل گیا اور زندگی میں پہلی بار وہ شے کھائی جس کی وجہ سے ہاپوڑ دنیا میں مشہور تھا: ہاپوڑ کے پاپڑ۔ سچ تو یہ ہے کہ اتنے نفیس، روئی سے بھی ہلکے پاپڑ میں نے پھر کبھی نہ کھائے، نہ دیکھے اور نہ کبھی ہاتھ میں لئے۔ یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہاپوڑ کے پاپڑ آپ کی ہتھیلی پر رکھ دوں تو آپ کو پتہ بھی نہ چلے کہ ہاتھ پر کوئی چیز رکھ دی گئی ہے۔ وہیں میں نے بالکل تازہ پھلوں کی چاٹ کھائی جس میں کمرخ ضرور پڑا ہوتا تھا، ستارے جیسا کھٹا میٹھا۔ اور وہیں حلوائی کے کڑھاؤ کا کھولتا ہوا دودھ مٹّی کے کُلھڑ میں پیا اور پہلی بار جانا کہ سوندھا دودھ کیسا ہوتا ہے۔ یہ داستان ابھی جاری ہے۔

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ حالات بہتر ہوئے تو میرے کنبے والے واپس

روڑکی چلے گئے اور مقامی گورنمنٹ اسکول میں میرا داخلہ ہوگیا۔ عجب اتفاق ہوا کہ یہاں بھی وہی لطیف صاحب ہیڈ ماسٹر تھے جو بار بار ٹوپی اتار کر اپنا سر کھجاتے تھے اور یہاں بھی حساب کے استاد وہی سادھو رام تھے جو استاد کم اور سادھو زیادہ لگتے تھے۔ یہاں کندن سنگھ نہیں تھے لیکن ان ہی جیسا ایک استاد یہاں بھی ملنے والا تھا جس کی بات ذرا دیر بعد۔ اس وقت ہمیں ہاپوڑ کی خوبیوں کا علم نہ تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آج کے عظیم افسانہ نگار انتظار حسین ہاپوڑ میں رہتے تھے اور میرے اسکول کے قریب ایک پرائیوٹ کالج میں داخل تھے اور یہ کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق اسی شہر کے باشندے تھے۔ میرٹھ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور وہاں تو پڑھے لکھے اور باکمال لوگوں کی بھرمار تھی۔

مگر مجھے ہاپوڑ میں جس بلا کی ذہین شخصیت کی قربت نصیب ہوئی وہ کوئی اور نہیں، میری سب سے بڑی بہن، ابّی باجی تھیں۔ اُس وقت ان کے چھ بچّے تھے۔ باجی ان سب کی بڑے پیار سے دیکھ بھال کرتی تھیں۔ بہنوئی علاقے کے بڑے حاکم تھے اس لئے گھر میں گاؤں کے اصلی گھی، انڈوں، دودھ اور شہد کی بہتات تھی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے ہم سب چولھے کے گرد بیٹھتے تھے۔ باجی توے پر روغنی ٹکیاں پکاتیں، انہیں کوئلوں پر سینکتیں اور جب ٹکیاں پھول جاتیں تو انہیں گھی سے بھرے کنستر میں ڈبو کر نکالتیں اور ایک ایک بچے کو دیتی جاتیں۔ ایسی غذا پر پل کر ہم بڑے ہونے لگے۔ شام کو باجی ہم سب کو لے کر بیٹھتیں اور اردو پڑھاتیں (اسکول میں ہندی زور پکڑنے لگی تھی) اس وقت اسماعیل میرٹھی کی کتابیں نکالی جاتیں۔ باجی بڑی سمجھ داری سے ہمیں نظمیں یاد کراتیں جو مجھے آج بھی ازبر ہیں۔ اس طرح گھر میں ایک اسکول بن گیا۔ باجی نے مجھے اور میرے ہم عمر بھانجے ریاض حیدر کو، جن کا

پیار کا نام افسر ہے، استاد بنا دیا اور چھوٹے بھانجے بھانجیاں، روشن، کوثر، نازک، نیّر ،انجم شاگرد بن گئے۔ کلاسیں لگنے لگیں، امتحان ہونے لگے، ہم نے ایک ہم جماعت کو انسپکٹر بنا دیا جو اسکول کا معائنہ کرنے آتا۔ یوں کھیل ہی کھیل میں ہم سب کی تربیت ہونے لگی۔ اسکول کے علاوہ ہماری ٹیوشن کا بندوبست کیا گیا اور یوں مجھے ایک ایسا استاد ملا جس کی شخصیت کا سایہ آج تک میرے ساتھ چلا آتا ہے۔ وہ ہمارے کلاس ٹیچر بھی تھے۔ شام کو مغرب کے بعد میں اور افسر لالٹین لے کر ان کے گھر پڑھنے جاتے تھے۔ وہ استاد کم، فرشتہ زیادہ تھے۔ بے حد شائستہ، بہت ہی شفیق، نہایت بردبار۔ ان کی جو بات مجھے بہت پسند تھی وہ یہ کہ وہ اپنی ماتاجی کے پاس جب بھی بیٹھتے، ان کے قدموں میں بیٹھتے۔ ہم لڑکوں کو یوں پڑھاتے تھے جیسے ہمارے ساتھ خود بھی پڑھ رہے ہوں۔ گرمیوں میں ہم سب کو آموں کے باغ میں لے جاتے اور ہم سب درختوں کے سائے میں بیٹھ کر سبق یاد کرتے۔ ان کی ایک اور بات جو مجھے پسند تھی، یہ تھی کہ بلا ناغہ اپنا روزنامچہ لکھتے تھے۔ ایک بار کسی حادثے میں ان کا دایاں ہاتھ زخمی ہو گیا تو وہ اپنا روزنامچہ املا بول کر مجھ سے لکھوانے لگے۔ تب مجھے پوری طرح اندازہ ہوا کہ ان کے اندر کیسا دردمند انسان چھپا ہوا تھا۔ اسکول کے امتحان ہونے والے تھے۔ وہ مجھ سے نویں کلاس کا پرچہ لکھوانے چلے۔ دوسرے استادوں نے انہیں روک دیا ورنہ ان کے اعتماد کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بس ایک غضب ہو گیا۔ مجھے ان کا نام یاد نہ رہا، شاید اس لئے کہ استاد کا نام لینا بدتہذیبی تصور کیا جاتا تھا اور ہمیں تہذیب کسی اور نے نہیں، ابی باجی جیسی بہن نے سکھائی تھی۔

میری تحریک، میرا ترک وطن

ملک میں آزادی کی تحریک چل رہی ہوگی۔ میں تو اپنے چھوٹے سے شہر کو جانتا تھا جس میں جن سنگھ کی تحریک جاری تھی۔ ہمارے کمپنی باغ کے اُس آدھے حصے میں جو ہمارے گھر سے قریب تھا، ہر شام جن سنگھیوں کی پریڈ ہوتی تھی۔ شہر کے ہندو لڑکے کٹھل کے درخت کے نیچے باقاعدگی سے جمع ہوتے اور پریڈ کے علاوہ کچھ عجب داؤ پیچ سیکھتے اور کبھی کبھی لاٹھی چلاتے دکھائی دیتے۔

ایک روز میری عمر کے مسلمان لڑکے جمع ہوئے اور طے پایا کہ باغ کے دوسرے نصف میں ہم بھی اپنی پریڈ کریں گے۔ ہم لوگ گھر گھر گئے اور لوگوں سے کہا کہ اپنے لڑکوں کو مسلمانوں کی پریڈ میں بھیجیں۔ ہمیں اس وقت حیرت ہوئی جب شام سے پہلے پہلے تیس چالیس لڑکے ہر سمت سے چلتے ہوئے کمپنی باغ پہنچ گئے۔ ہماری پریڈ شروع ہوگئی اور ہر شام لڑکوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ایک روز میرے بڑے بھائیوں نے مجھ سے کہا کہ تم بھی پریڈ میں جایا کرو۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ اس پریڈ کا بانی میں ہی ہوں۔ ہم پریڈ کرانے کے کوئی بڑے ماہر نہیں تھے، جو سمجھ میں آتا تھا، کر لیتے تھے۔ کچھ روز بعد شہر کے کچھ جوان آئے اور کہا کہ وہ پریڈ کرانا چاہتے ہیں۔ ہم بہت خوش

ہوئے۔ان میں ایک جوان حیدر آباد دکن سے آیا تھا اور وہاں قاسم رضوی کی رضا کار فورس میں شامل رہ چکا تھا۔اس نے تو فوجی انداز کی تربیت شروع کردی۔سارے لڑکے مل کر گاتے تھے، کچھ اس طرح کے بول تھے۔''تیز ترک گامزن، منزلِ ما دور نیست''۔اسی میں آگے چل کر ایک بول تھا۔''آرہے ہیں سامنے، جارہے ہیں سامنے، گارہے ہیں سامنے، دشمنان روسیاہ''۔

ان ہی دنوں میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد جو پہلے الیکشن دیکھے وہ کسی گاؤں دیہات کے نہیں، ایک ملک اور ایک قوم کی تقدیر کے انتخابات تھے۔کیسے چاؤ اور لگن سے وہ انتخابات لڑے گئے تھے۔اس چاؤ میں کتنے خوابوں اور تمناؤں کا رچاؤ تھا۔یہ جنوری ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔کہنے کو وہ برٹش انڈیا کے صوبائی الیکشن تھے مگر ان ہی کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آنا تھا۔آزادی کی تحریک بدل کر پاکستان کی تحریک بن چکی تھی۔پُر جوش لوگوں کی ٹولیاں گلی کوچوں میں نعرے لگاتی پھر رہی تھیں، 'لے کے رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان'۔اور کبھی کبھی یہ نعرہ بھی سننے میں آتا۔''خون سے لیں گے پاکستان''۔ان ہی دنوں مجھے نوابزادہ لیاقت علی خاں کا روڑکی آنا یاد ہے۔وہ انتخابی مہم کے سلسلے میں نکلے تھے اور ایک رات روڑکی میں قیام کیا تھا۔ان کے لئے باجیوں نے بڑی تھال بھر کے شاہی ٹکڑے بھیجے تھے۔میرے بھائیوں نے ایک شام شہر میں ایک طرحی مشاعرہ بھی کرایا تھا اور اس کے پوسٹر ہاتھ سے بنا کر دیواروں پر چپکائے تھے۔پوسٹر پر مصرعہ طرح لکھا تھا: پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔اس کے نیچے کسی نے لکھا تھا: گر بجھ گیا تو منہ بھی دکھایا نہ جائے گا۔ ان ہی دنوں شہر میں خاکساروں کی پریڈ ہوئی اور کاندھوں پر بیلچے اٹھائے وہ فوجی انداز کی پریڈ کررہے تھے۔کچھ مسجدوں سے پاکستان کے خلاف آوازیں اٹھ رہی تھیں،

لیکن ہم نے ان پر کبھی کان نہ دھرا۔ مقابلہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تھا۔ اس تحریک میں ہمارا گھرانا بھی شامل تھا۔ مسلم لیگ کے تاریخی جلسوں میں شرکت کے لئے ابا ایک بار دکن اور ایک مرتبہ لاہور جا چکے تھے۔ باجیاں بتاتی ہیں کہ آج بھی قراردادِ لاہور کے سنہ چالیس کے جلسے کی جو فلم چلائی جاتی ہے اس میں ابّا نظر آتے ہیں۔

روڑکی کی سڑکوں پر مسلم لیگ کے رضا کاروں کے دستے گشت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ابّا نے میرے لئے بھی رضا کاروں کی ہری وردی بنوادی تھی جس کی ٹوپی پر روپہلی چاند ستارا لگا تھا۔ مجھے جلوسوں میں اپنا نعرے لگانا بھی یاد ہے۔ ابّا بہت کم گھر سے نکلتے تھے مگر پولنگ سے ایک دن پہلے اپنی عادت کے مطابق اچکن اور دوپلّی ٹوپی پہن کر نکلے اور مجھے ساتھ لے کر شاید زندگی میں پہلی بار جولاہوں کی بستی میں پہنچے۔ ہم گھر گھر گئے اور لوگوں کو سمجھایا کہ انہیں کس طرح ہرے ڈبّے میں اپنی پرچی ڈالنی ہوگی۔ اس الیکشن میں پرچی پر نشان نہیں لگایا جارہا تھا بلکہ لوگ ہرے یا سفید ڈبے میں ووٹ ڈال رہے تھے۔ صبح پولنگ شروع ہوئی تو ابّا اور بڑے بھائی دکان میرے حوالے کر کے میونسپلٹی چلے گئے جہاں ووٹنگ ہو رہی تھی۔ بھائی نے وہاں لاؤڈ اسپیکر لگا دیا تھا جس کا تار ہماری دکان تک آتا تھا۔ وہاں ایک مائیکروفون اور ایک گراموفون لگا تھا۔ مجھے دو چار فقرے یاد کرا دیئے گئے تھے۔ مثلاً یہ کہ اپنی پرچی ہرے ڈبے میں ڈالئے اور مسلم لیگ کو کامیاب بنایئے۔ اسی طرح گراموفون پر مسلسل چلانے کے لئے مجھے ایک ریکارڈ دے دیا گیا جس کے بول تھے: ملّت کا پاسبان محمد علی جناح۔ اُس روز میں نے زندگی میں پہلی بار اس مائیکروفون پر لب کشائی کی جس کے بارے میں میرے فرشتوں کو ہوتو ہو، مجھے احساس تک نہ تھا کہ یہی چھوٹا سا آلہ میری آواز میں

آواز ملا کر مجھے کہاں تک لے جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے میں تاریخ پر چھوڑتا ہوں۔

یوم آزادی کی آدھی رات مجھے یاد ہے۔ ہم سب کوٹھے پر ریڈیو کھولے بیٹھے تھے اور لاہور اسٹیشن کی نشریات سن رہے تھے۔ نیچے سڑکوں پر اور گلیوں میں جشن کا سماں تھا۔ ہندو آبادی گا رہی تھی، ناچ رہی تھی اور قندیلیں اڑا رہی تھی۔ ٹھیک بارہ بجے سے پہلے اسٹیشن پر نئی آواز گونجی اور اعلان ہوا: یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس ہے۔ قیام پاکستان اور آزادی مبارک ہو۔ بس اس کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ اگرچہ ہمارے شہر میں قتل و غارت گری نہیں ہوئی لیکن ہر طرف سے دل دہلا دینے والی خبریں آنے لگیں۔ جوالا پور نام کی کوئی بستی تھی، وہاں غضب کی خوں ریزی ہوئی۔ ابا اپنے کنبے کی طرف سے پریشان تھے۔ آخر وہ خود اور بھائی مصطفیٰ علی گھر پر ٹھہرے اور باقی سب لوگ ہاپوڑ، لکھنؤ اور کانپور بھیج دیئے گئے۔ اوپر سے غضب یہ ہوا کہ کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ آخر کار طے ہوا کہ یہاں کا آب و دانہ اٹھ چکا ہے، بہتر ہے اب اُس نگر کا رُخ کیا جائے جس کے ہم نے اپنی گلیوں میں نعرے لگائے تھے۔ اِس سے پہلے دلّی میں بڑی باجی ہمارے بہنوئی کے ساتھ پناہ گزینوں کی اسپیشل ٹرین سے آگ اور خون کے دریا پار کر کے پاکستان جا چکے تھے۔ بڑے بھائی اصغر علی امریکہ میں اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے کراچی پہنچ گئے اور حکومت سندھ سے وابستہ ہوئے۔ مجھ سے بڑے بھائی مرتضیٰ علی لاہور چلے گئے اور سائنس کی تعلیم جاری رکھی اب باقی کنبے کی باری تھی۔ پاکستان جانے کے لئے ہم سب اور ہماری بوڑھی پھوپھی کے پرمٹ بن کر آئے اور گھر کا سامان باندھا جانے لگا۔ اور جو بندھ نہ سکا وہ روڑکی کی سڑکوں پر نیلام ہوا۔ ابّا بری طرح الجھے ہوئے تھے اور گھر کی ہر شے کے لئے کہتے تھے: نکالو، نکالو۔ اب مسئلہ

تھا جمع پونجی سرحد پار لے جانے کا۔ پانچ ہزار روپے ساتھ لے جانے کی اجازت تھی۔ پس انداز کی ہوئی باقی رقم پاکستان بھیجنے کی راہ یوں نکالی گئی کہ ہمارے محلے میں سگریٹ بیڑی کے بڑے تاجر تھے، فرض کیجئے ان کا نام ریحان صاحب تھا۔ انہوں نے ابّا کو پیش کش کی کہ اپنی رقم مجھے دے دیجئے اور کراچی جا کر میرے بھائی سے وصول کر لیجئے گا۔ یہ رقم کئی ٹکڑیوں میں ریحان صاحب کے حوالے کی جاتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ابّا ان کے کراچی والے بھائی کو پوسٹ کارڈ لکھتے رہے جسمیں خفیہ اشاروں میں لکھا جاتا تھا کہ ہم نے اتنی ہزار سگریٹیں تمہارے روڑکی والے بھائی کے حوالے کر دی ہیں۔ یہ پوسٹ کارڈ میں نے ڈاک میں ڈالے اور راہ میں پڑھے بھی۔ ابّا کی برسہا برس کی کمائی میں نے یوں جاتے دیکھی۔ آخر وقت رخصت آن پہنچا۔ ابّا پر عجب سراسیمگی طاری تھی۔ انہیں یہ فکر تھی کہ پہلی بار گھر کی عورتوں کو بے پردہ کر کے پردیس لے جانا ہے۔ راہ کی روداد آگے چل کر لکھوں گا، یہاں اس پہلے صدمے کا حال کہہ دوں جو پاکستان پہنچ کر اٹھانا پڑا۔

کراچی جاتے ہی ابّا ریحان صاحب کے بھائی سے اپنی رقم لینے گئے۔ بھائی نے انہیں تھوڑی سی رقم دے کر اپنا دامن جھاڑ کے دکھایا اور ابّا کو چلتا کیا۔ ابّا اپنی سفید پوشی کو سنبھالے خاموشی سے چلے آئے اور پھر جتنے مہینے زندہ رہے، انہیں چپ لگی رہی۔ روڑکی میں ریحان صاحب نے اپنا پرانا مکان گرا کر اس کے اوپر اونچی عمارت کھڑی کر دی ہے جس پر بڑے بڑے حروف میں لکھا ہے: ریحان ٹاورز۔

ہچکولے کھاتے ہوئے ہمارے تانگے آخری بار میرے اسکول کے سامنے سے گزرے۔ وہ ایک لمحہ تھا جب مجھے اپنا گھر چھوڑنے کا افسوس ہوا۔ میں نے اسکول

کے احاطے میں اس درخت کو دیکھنا چاہا جو ہم لڑکوں نے مل کر لگایا تھا، مگر وہ نظر نہ آیا۔ تانگے آگے بڑھتے گئے۔ اسکول کی عمارت چھوٹی ہوتی گئی۔ یہ سنہ پچاس کی بات ہے۔ روڑکی شہر کا حلیہ بدل چکا تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد اِدھر کی آبادی اُدھر اور اُدھر کی آبادی اِس طرف منتقل ہوئی۔ پاکستان کے علاقوں سے پناہ کی تلاش میں آنے والے شرنارتھیوں کی یلغار ہوئی تو ہمارا شہر راتوں رات انسانوں سے بھر گیا۔ اسکول کی جس جماعت میں تیس بتیس سے زیادہ لڑکے نہیں ہوتے تھے اس میں سرکار کے حکم سے پچاس پچاس طالب علم بھر دیئے گئے۔ اسی طرح شہر کے گلی کوچوں، دکانوں اور بازاروں کا نقشہ بدل گیا ہر پرانی اور چلتی ہوئی دکان کے آگے فٹ پاتھ پر کسی شرنارتھی نے ٹاٹ بچھا کر کاروبار جما لیا۔ وہ بھی اس شان سے کہ گاہک کے پاس پیسے نہ ہوں تو کہتے تھے کہ پھر کبھی دے دینا۔ یوں غضب ہوا کہ لوگوں کا جما جمایا کاروبار خاک میں مل گیا۔ شہر میں مجمع بڑھا تو وہ پہلے جیسا سکون اور زندگی کی آہستہ روی جاتی رہی۔ شہر کا انجینئرنگ کالج بڑھ کر یونی ورسٹی بن گیا۔ اس کے ساتھ دوسرے ادارے کھلنے لگے۔ لوگوں کو ملازمتیں ملنے لگیں۔ وہ جو سرسبز میدان تھے، شہر سے سولانی ندی تک دریا نے وادی میں جو میدان تراشا تھا جسے برف خانہ کہا جاتا تھا، اس میں افسروں کی کالونیاں بننے لگیں۔ یہی برف خانہ تو تھا جہاں کہتے ہیں جاڑوں کی راتوں میں تھالوں میں بھر کر پانی رکھ دیا جاتا تھا جو صبح تک برف بن جاتا تھا، یہ برف زمین میں دبا دی جاتی تھی اور گرمیوں کے دنوں میں نکالی جاتی تھی۔ قریب ہی انگریزوں کے بنائے ہوئے دلکش کمپنی باغ میں سبزی منڈی بن گئی اور باغ کے بیچوں بیچ سنگ مرمر کا کنول کے پھول جیسا فوارہ تعمیر کیا گیا تھا اسے بے رحمی سے اکھاڑ کر وہاں پانی کا پمپ بنا دیا گیا۔ رمضان میں روزہ کھولنے کے اعلان کی خاطر جو پٹاخا چلایا جاتا تھا، اسی فوارے پر رکھ

کر داغا جاتا تھا۔ اور وہ نہر جو روڑ کی کے ماتھے کا جھومر تھی، اس کی تہہ میں ریت بیٹھنے لگے۔ اسی نہر کا میٹھا پانی ہر روز شہر میں پھیلی ہوئی نالی میں بہایا جاتا تھا جو ساری غلاظت بہالے جاتا تھا، وہ پانی روک کر لوگ اپنے ٹھکانوں کے آگے چھڑکاؤ کیا کرتے تھے۔ وہ پانی اتنا صاف ہوتا تھا کہ ہمارا ڈیری والا اپنے مکھن نکالنے کے برتن اسی میں دھوتا تھا۔ اسی چھڑکاؤ پر شام کو ابّا کے دوستوں کی بیٹھک ہوتی تھی۔ ان میں بابو عبدالرحمان ہمیشہ یاد رہیں گے جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے اور مجھے جب بھی دیکھتے یہی کہتے کہ بہت دبلے ہو رہے ہو۔ قریبی قصبے پُرقاضی سے ایک اور بزرگ نعیم صاحب آیا کرتے تھے۔ اسی طرح کرّار صاحب تھے، ڈاکٹر عبدالمجید تھے، یہ سب کسی کو بتائے بغیر خاموشی سے پاکستان چلے گئے۔ میرا ہم عمر عبدالروف تھا، وہ غائب ہو گیا اور کراچی میں نمودار ہوا۔ بس ساری فضا بدلنے لگی۔ سارا ماحول نئے رنگ میں رنگا جانے لگا۔ شہر کے بازاروں میں وہ جو کھڑی بولی سننے میں آیا کرتی تھی جس کے ہر لفظ پر تشدید لگی ہوتی تھی، اس کی جگہ پنجابی آوازیں کانوں میں پڑنے لگیں۔ میرا تانگہ اسکول کے سامنے سے گزر تو گیا لیکن خود اسکول شاید میرے وجود سے لگا لگا میرے ساتھ آ گیا۔ اب یہ ہوا کہ وہ ہر رات میرے خواب میں آنے لگا۔ ہر رات یہی دکھائی دیتا کہ اسکول کی عمارت کا حال اچھا نہیں۔ لاکھ چاہا کہ اس کے خواب میرا پیچھا چھوڑ دیں مگر وہ نہ مانے۔ پینتیس سال بعد جب میں دوبارہ روڑکی گیا تو اپنے دوستوں سے کہا کہ پہلے چل کر مجھے اسکول دکھا دو۔ شاید اس کے بعد وہ خوابوں میں آنا چھوڑ دے۔ یہ تدبیر کام کر گئی۔ خوابوں کے اسٹیج کا پردہ گر گیا۔ ابھی پچھلے دنوں یونس حلوائی کا پوتا میری فرمائش پر میرا اسکول دیکھنے گیا۔ اس نے آ کر ایک خبر سنائی۔ کہنے لگا کہ اسکول تو سلامت ہے لیکن ابھی کچھ روز پہلے جو تیز ہوا چلی اور بارش ہوئی تھی اس میں

آپ کا لگایا ہوا درخت گر گیا۔ میں نے پوچھا۔ 'کیوں'۔ اس نے کہا۔ 'درخت بہت بڑا ہو گیا تھا، خود اپنا وزن سنبھال نہ سکا'۔

اب کیا کیا جائے؟ اس کا کیا حل ہو؟ مجھے اپنی تیسری جماعت کے انگریزی کے استاد مسٹر پیٹر کا سکھایا ہوا جملہ یاد آ گیا۔ وہی اس مسئلے کا حل تھا۔ انہوں نے ہمیں سکھایا تھا۔ 'Shut the door' بھیڑ دو اس کواڑ کو۔

سو ہم نے بھیڑ دیا۔

پھر یہ ہوا کہ جو کچھ ساتھ جا سکتا تھا وہ بندھ گیا۔ باقی پورا گھر جوں کا توں چھوڑ کر ہم سب نیچے اتر آئے جہاں تانگے گلی میں لگ چکے تھے۔ شہر والوں سے کہا گیا تھا کہ ہم لوگ لکھنؤ جا رہے ہیں لیکن انہیں خوب اندازہ تھا کہ میر صاحب نے جس پاکستان کی خاطر دوڑ دھوپ کی آخر وہی ان کی منزل ٹھہرے گا۔ عین اسی وقت مولوی غفران ابّا سے ملنے آئے، ابّا نے انکار کر دیا تو وہ زینہ چڑھ کر اوپر آ گئے کہ ایک بار مل لیجے لیکن ابّا پر جو کیفیت طاری تھی اس نے انہیں چڑچڑا کر دیا اور ہمارا سینٹھے کا قلم بنانے اور کاپیاں کتابیں فراہم کرنے والے مولوی غفران ہم لوگوں کو الوداع نہ کہہ سکے۔ اس روز ہم سب پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ مجھے یاد نہیں کسی نے پلٹ کر آخری بار گھر کو دیکھا ہو۔ پورا کنبہ روڑکی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا حالانکہ گاڑی آنے میں بہت دیر تھی۔ ابّا کی یہ عادت تھی، بہت پہلے اسٹیشن چلے جاتے تھے۔ آخر ٹرین آ گئی۔ سامان کا وزن کر کے بریک میں رکھوا دیا گیا اور ادائیگی کر دی گئی۔ ہم ایک نئے وطن اور اجنبی شہر کی طرف چل پڑے۔ راہ میں صرف چھوٹی باجی روئیں۔ وہ نہیں جانا چاہتی تھیں۔ ان کی کمر میں جو تکلیف تھی وہ بڑھ گئی، اتنی کہ

سہارن پور کے اسٹیشن پر بڑے بھائیوں کو بھاگ کر شہر سے ان کی دوا لانی پڑی۔ ملک میں کشیدگی برقرار تھی۔ ابّا نے خواتین کے برقعے اتروا دیئے حالانکہ دور سے نظر آ رہا تھا کہ ایک مہذب مسلمان کنبہ پاکستان کی سمت جا رہا ہے۔ دن ڈھلنے سے پہلے ہم سرحد پر پہنچ گئے۔ کسٹم والے ہمارے سامان کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایک ٹوکری نما بکس میں میرے ڈاک کے وہ ٹکٹ بھرے ہوئے تھے جو میں نے برسوں قلمی دوستوں سے تبادلے میں جمع کئے تھے۔ یہ شوق بھی دیوانگی کی حد تک تھا، کسٹم افسر اسے دیکھ کر محظوظ ہوا۔ پھر وہ اس صندوق کو کھولنے لگا جس میں محرّم کی عزاداری کے قدیم تاریخی علم اور پٹکے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اس افسر کو بتایا کہ اس میں ہماری مذہبی چیزیں ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹا جیسے اس کے ہاتھ لگانے سے سب کچھ نجس ہو جائے گا۔ یہ سارے مرحلے آسانی سے طے ہو گئے۔ اب قلی ہمارا سامان اٹھا کر آگے آگے چلے (سامان کو شمار کرتے ہوئے اسے نگ کہا جا رہا تھا)۔ ہم قلیوں کے پیچھے پیچھے تھے کہ وہ موٹی سی سفید لکیر آ گئی جو بھارت اور پاکستان کی سرحد تھی۔ میں نے صدق دل سے بسم اللہ کہتے ہوئے پاکستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا۔ اگلے ہی لمحے ہم اپنے نئے وطن میں تھے۔ وہاں مجھ سے بڑے بھائی مرتضیٰ علی ہمیں لینے آئے تھے۔ وہ اپنی تعلیم کے لئے پہلے ہی لاہور پہنچ چکے تھے۔ ابّا نے انہیں کچھ بھارتی روپے دیئے تاکہ وہ ان کے عوض پاکستانی نوٹ لا سکیں۔ وہ بھی آ گئے اور ہم شاید ٹیکسیوں میں بیٹھ کر لاہور کے مشہور و معروف قلعہ نما ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ ایک بار پھر وہی مرحلہ تھا، سامان وزن کرا کے ٹرین کے بریک میں رکھوانا تھا۔ ریلوے کلرک نے وزن کے حساب سے رقم بتائی جو بھارت کی رقم کے مقابلے میں دوگنی تھی۔ رقم سن کر ابّا بولے ''یہ تو بہت زیادہ ہے''۔ اور پھر

انہوں نے کہا۔ ''خیر اپنا وطن ہے''۔ میں چھوٹا سا لڑکا قریب کھڑا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا اور نہیں معلوم کیوں ذہن کے کسی گوشے میں یوں محفوظ کر رہا تھا جیسے یہ سب کچھ کبھی کام آئے گا۔

ریل گاڑی کے طویل سفر کے بعد ہماری گاڑی کراچی سٹی کے اسٹیشن پہنچی جہاں ہم نے پہلی بار بجلی کا ایسا بلب دیکھا جس کے اندر چاند اور ستارا روشن تھا۔ پوری ٹرین کا رنگ گہرا سبز تھا اور ڈبوں پر خوش خط لکھا ہوا 'پاکستان ریلوے' دیکھا تو ملی جلی مسرت اور حیرت ہوئی۔ وہاں ہمارے بہنوئی ہمیں لینے آئے تھے۔ میں نے ان سے پہلا سوال یہ پوچھا۔ ''سمندر کدھر ہے''؟

یہاں میرے لڑکپن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور چلتا بنا۔ وقت کا ڈھب بدلا۔ زندگی سخت ہونے لگی۔ میں بڑا ہونے لگا۔ گھر کے پرانے کاغذوں میں پچھلے دنوں ایک خط نکلا۔ ابّا کا آخری خط، وہ پڑھنے کے لئے آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔

ہم تمام عمر 'خدا حافظ' کہتے آئے تھے۔ یہاں وہ رسمیں بدل گئیں: اللہ حافظ۔

ابّا کا آخری خط

گھر کے پرانے کاغذات سے ابّا پرانا خط نکلا جو انہوں نے اپنے بیٹے مرتضٰی علی کو لکھا تھا، مرتضٰی ہم سے پہلے پاکستان آ گئے تھے اور لاہور میں سائنس کی تعلیم پا رہے تھے۔ بھائی سرور علی اپنی تعلیم کی وجہ سے کانپور میں رُک گئے تھے اور کراچی آنے والے تھے۔ اپریل سنہ اکیاون کے آخر میں ابّا پر فالج کا حملہ ہوا۔ سارے بیٹے ان کے گرد موجود تھے۔ وہ آخری سانسیں لے رہے تھے جب بہنوں نے ان سے کہا کہ بھائی جان کو (حسن علی نے اپنی راہ الگ کر لی تھی) معاف کر دیجئے۔ ابّا نے ہاتھ

کے اشارے سے کہا۔ ''معاف کیا'' اور آنکھیں موندلیں۔

۷۸۶

از کراچی مورخہ ۱۵ دسمبر سنہ ۵۰ء

برخوردار نور چشم، راحتِ جاں سلمہ

دعا کے بعد معلوم ہو کہ ایک خط معہ پارسل رجسٹرڈ پوسٹ ۱۵ دسمبر کو اور بیس روپیہ کا منی آرڈر برائے تمہارے سفر خرچ کراچی آنے کے لئے ۹ دسمبر کو روانہ کئے گئے۔ امید ہے تم خیریت سے ہوگے اور دونوں چیزوں کے پہونچ جانیکی رسیدات سے بواپسی مطلع کروتا کہ اطمینان ہو۔ سرور علی کا خط بہت عرصے کے بعد مجھکو ملا۔ سالانہ امتحان کی فکر میں غرق ہیں۔ ہملوگوں کے سبکے چلے آنے پر اب اونکو اپنی تنہائی کی کچھ فکر ہوئی ہے۔ رضا علی سلمہ نویں میں داروغہ یعقوب خان کے لڑکے کے ساتھ داخل ہو گئے ہیں۔ اقبال میاں گھر کے بہت قریب تیسری میں پڑھنے جانے لگے ہیں۔ مکان کا سوال یہاں بڑا بے ڈھب ہے۔ ہم لوگوں کے لئے جو مکان لے رکھا ہے اوّل تو وہ بھنگیوں کی کالونی ہے دوسرے بہت مختصر ہے، صرف دو آدمی اوسمیں رہ سکتے ہیں۔ فی الحال ہملوگ تمہاری بہن کے مکان میں مقیم ہیں۔ سرور علی نے مشورہ دیا ہے کہ دیواروں کے سہارے اوپر تلے کرچ کے یا تختوں کے برتھ بنوالئے جاویں۔ مگر یہ تو جب ہو جب یہاں مستقل رہنا ہو۔ تمہارے مصطفیٰ بھائی ایک ریڈیو کی دکان پر کام تو کر رہے ہیں مگر اس نے ابھی تک اونکی تنخواہ نہیں کھولی۔ خیال ہے ڈیڑھ سو یا زیادہ سے زیادہ دو سو سے زیادہ نہ دے گا۔ میری طبیعت ناسور کے زور کی وجہ سے خراب ہے۔ یہاں مجھ کو گھر کا سودا سلف لانے اور ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے کوئی کام نہیں ہے اور نہ اب میں کسی کام کے کرنے کے لائق ہوں۔ اس وقت تک تم سب کو کھلایا

پلایا، پڑھوایا لکھوایا مگر اب چند دنوں میں موجود سرمایہ ختم ہو جانے پر تم لوگوں کا دست نگر ہو جاؤں گے۔ میرا بوجھ بذات خود کسی پر نہیں پڑے گا۔ صرف دو وقت کی چائے اور ایک وقت کی روٹی کا طالب ہوں گا۔ کپڑا میرے پاس پھٹا پرانا یا نیا جو کچھ ہے وہ میری زندگی بھر کے لئے کافی ہے۔ آئندہ مجھ کو کپڑوں کی ضرورت نہ پڑے گی اب رہ گئے کنبے کے باقی لوگ تو اپنے بچے کھچے سرمایہ میں اُس وقت تک گزر کر لیں جب تک تم اور سرور علی کھانے کمانے کے قابل نہ ہو جاؤ۔ اگر چہ مجھ کو اتنی طویل زندگی کی امید نہیں۔ معلوم نہیں کب اور کس وقت میری آنکھ بند ہو جاوے۔ بہر حال تمہاری ماں اور بہن کی فکر ضرور ہے۔ اور بس۔

فقط راقم سید اکبر علی بقلم خود

☆

نئے وطن نے ہمیں کیا کیا دیا

اپنی بات دل دکھانے والی بات پر نہیں ختم کرنا چاہتا۔ اس لئے پہلے کہی جانے والی داستان دوبارہ کہہ رہا ہوں، اسے میری خطا نہ جانئے، اسے میرے گھرانے کی چھوٹی سی خوشی سمجھ کر شریک ہو جایئے۔

ملک تقسیم ہوا، خوں ریزی ہوئی، خاندان بکھر گیا اور زندگی کی سختیاں سر اٹھانے لگیں لیکن ابّا کی کوششوں سے ایک کام ایسا تھا جو ایک روز بھی نہ رکا۔ سارے بھائیوں کی تعلیم مسلسل، بلا روک ٹوک، جاری وساری رہی۔ ایک بھائی لکھنؤ میں، ایک کانپور میں اور ایک ہاپوڑ میں پڑھتے رہے اور سب سے بڑے بھائی اصغر علی عابدی انجینئر نگ کی تعلیم پانے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں انہیں باپ کی سرپرستی اور دعا ایسی ملی کہ انہیں ہندوستان کی انگریز حکومت نے انجینئر نگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے دو سال کا

وظیفہ دے کر امریکہ بھیج دیا جہاں انہوں نے ایک سال اوہایو میں اور ایک سال اس سے بھی بڑی یونیورسٹی ہارورڈ میں بے مثال علم حاصل کیا۔ اس دوران ہندوستان کا بٹوارا ہوگیا اور ان سے پوچھا گیا کہ وہ امریکہ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھارت جانا چاہیں گے یا پاکستان۔ ابّا نے انہیں پاکستان جانے کی رائے دی۔ بھائی نے پاکستان پہنچ کر اپنی پیشہ ورانہ زندگی شروع کی اور پہلے کوٹری بیراج بنوایا جہاں ان کے نام کی تختی آج تک لگی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے تربیلہ ڈیم بنوایا اور آخر میں پہاڑ جیسا منگلا ڈیم اٹھانے میں ہاتھ بٹایا، یہاں تک کہ اقوام متحدہ نے دوسرے ملکوں میں ترقیاتی کام کرنے کے لئے ان کی خدمات مانگ لیں۔ اس طرح بھائی اصغر علی نے انجینئرنگ کے میدان میں اپنا اور ابّا کا نام روشن کیا۔ بھائی مصطفیٰ علی نے ابّا کے روزگار میں شامل ہونے کے لئے مختلف کورس کر کے ریڈیو بنانے کی تربیت حاصل کی۔ انہوں نے پاکستان میں پہلے ریڈیو اور پھر ٹیلی وژن بنائے اور اپنا کاروبار جما کر ریڈیو اور ٹی وی کی مرمت کے کام میں شہرت پائی۔ بھائی سرور علی نے کراچی میں سائنس پڑھی، وہ یونی ورسٹی میں اوّل آئے اور پرنٹنگ کی اعلیٰ تربیت کا وظیفہ پا کر لندن گئے اور واپس آ کر گورنمنٹ پرنٹنگ پریس سنبھالا۔ مرتضیٰ علی سائنس کی اعلیٰ تعلیم پا کر پاکستان میں اسلحہ سازی سے وابستہ ہوئے۔ ان کو الیکٹرونکس کی تربیت کے لئے جرمنی بھیجا گیا جہاں سے واپس آ کر انہوں نے پاکستان کی فوج کے لئے کوبرا میزائیل بنایا جو سنہ ۶۵ء کی جنگ میں استعمال ہوا۔ سب سے چھوٹے بھائی مہدی علی نے ،جنہیں سب اقبال کہتے ہیں، کراچی کی جیکب لائنز کے پولی ٹیکنک اسکول سے تعلیم شروع کر کے جست بھری اور اس سے آگے کی تعلیم پانے کے لئے انگلستان جا پہنچے۔ انہوں نے فن عمارت سازی، آرکی ٹیکچر میں جو اعلیٰ سند ہو سکتی تھی وہ پائی اور

برطانیہ کے خدا جانے کتنے علاقوں میں کتنی ہی عمارتیں بنوائیں۔ اس پورے کنبے میں ایک صاحب سب سے جدا تھے۔ سید رضا علی عابدی، جو اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے اندر انجینئرنگ کے جراثیم قسم کھانے کو بھی نہ تھے۔ ان کا ذاتی رجحان انہیں اخبار کی دنیا میں لے گیا جہاں سے ایک بڑا قدم اٹھا کر وہ ریڈیو کے جہاں میں وارد ہوئے لیکن ان کو ایک دکھ ہے اور بڑا دکھ۔ انہوں نے جس بلندی کو ہاتھ لگایا اسے نہ ابّا دیکھ پائے اور نہ امّاں نے دیکھا۔ اگر یہ سچ ہے کہ روحیں باقی رہ جاتی ہیں تو یقین ہے کہ وہ دونوں عالم بالا میں مسرور ہوں گے اور بڑے مسرور۔

ملک کے مسلمان لڑکوں کو روڑکی میں انجینئرنگ کی تعلیم دلانے کی تحریک چلانے والے ہمارے بزرگ۔
میرے والد سید اکبر علی بیٹھے ہوئے اکابرین میں بائیں جانب سے دوسرے ہیں۔ پشت پر وہ سات لڑکے کھڑے ہیں جنہوں نے انجینئرنگ کے مختلف شعبوں کی تعلیم پائی۔ ان میں مشہور مصور عسکری اور انجینئر منظور صاحب شامل ہیں۔
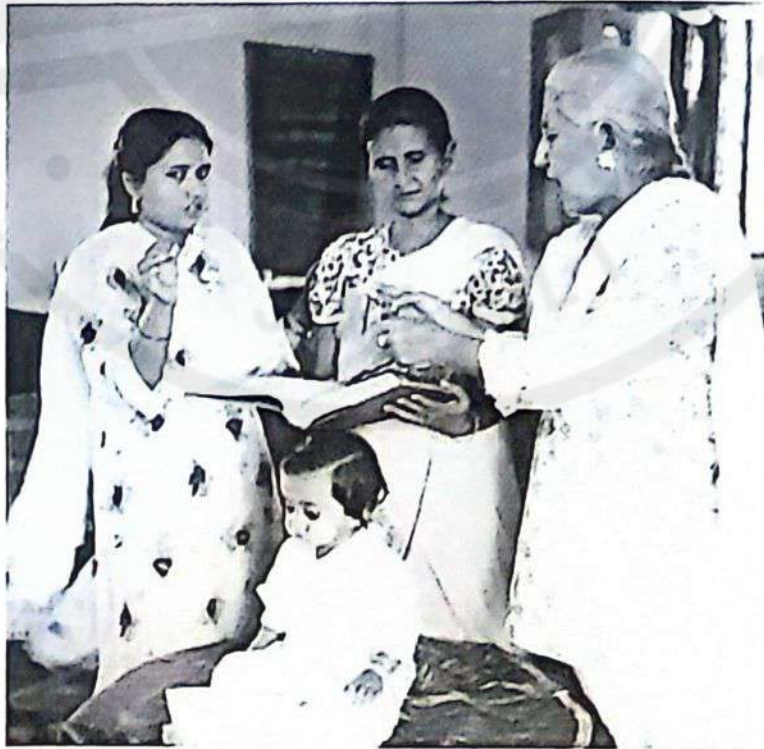
دائیں جانب سے: میری امّاں، سب سے بڑی بہن ابّی باجی۔ میری بھاوج جمیلہ بیگم اور ان کی بیٹی زیبا جس کی سالگرہ کے دن گرہ ڈالنے کی رسم ادا کی جارہی ہے۔
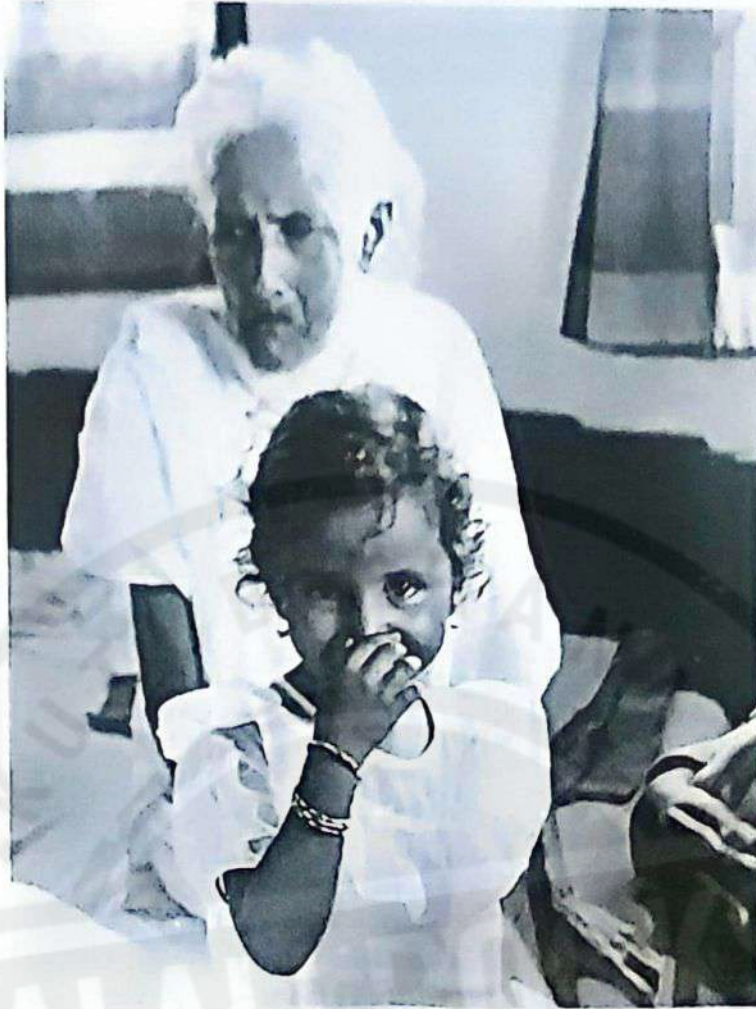
ابا کی بہن، میری پھوپی جنہیں سب امّی جان کہتے تھے۔ انہیں قدیم لکھنؤ کی باتیں یاد تھیں۔ سامنے میری بھانجی مسرّت بیٹھی ہے۔

چھوٹی باجی، یوسف جہاں بیگم۔ جنہوں نے امّاں کے بعد ان کی جگہ لے لی تھی۔
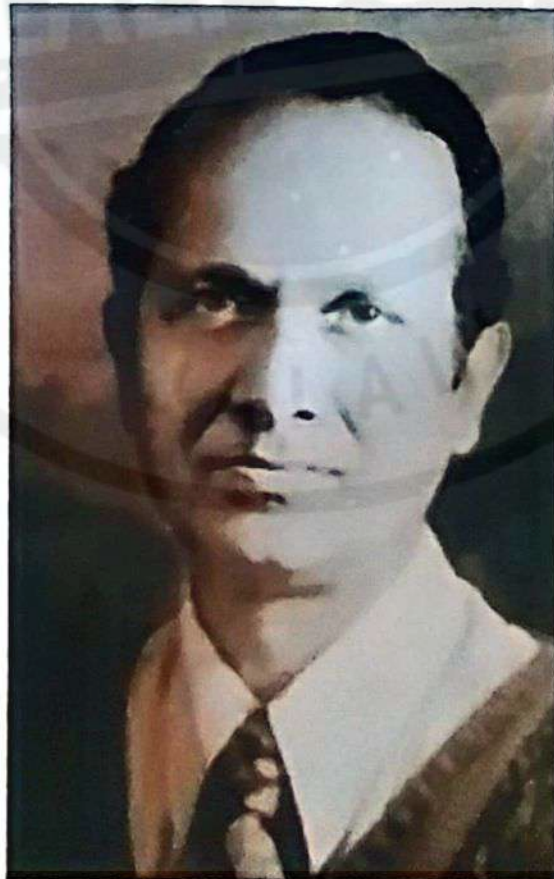
میرا بچپن کا ہم جماعت فیض محمد خاں۔ ہم دونوں سنہ ۴۴ میں گورنمنٹ اسکول میں داخل ہوئے تھے۔
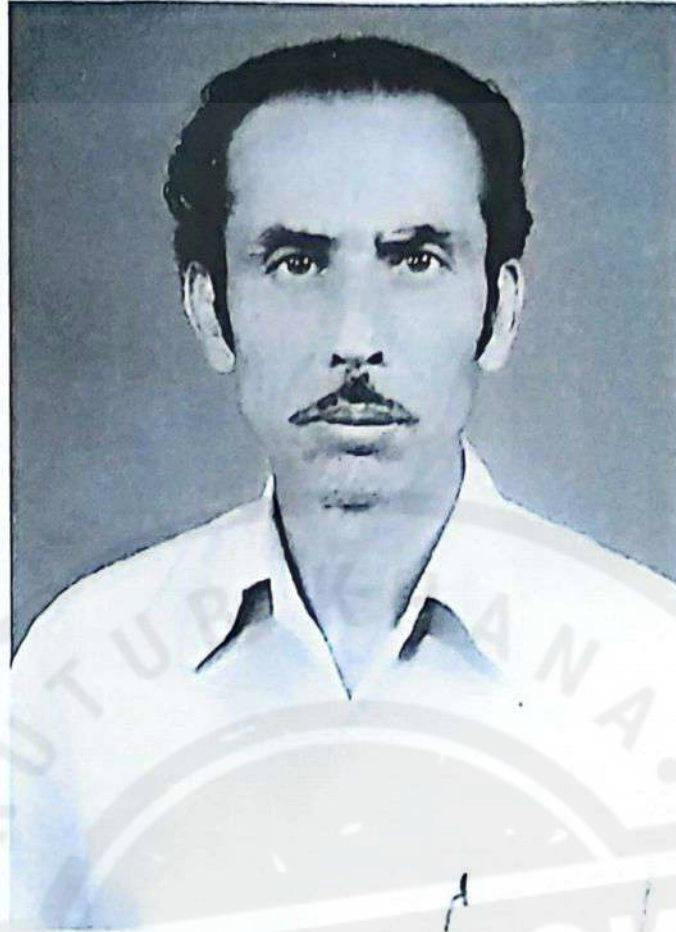
میرا بچپن کا دوست غلام صابر جن دنوں ہاکی کا نمبرون کھلاڑی تھا۔ میرے ساتھ اسکول میں داخل ہوا اور گھر میں شدید مفلسی کے باوجود ماں اسے تعلیم دلواتی رہیں۔

بچپن کے ہمجولی غلام صابر کی ۸۵ ویں سالگرہ کے دن کی تصویر، اس کے کچھ عرصے بعد چل بسا۔

ہماری سب سے بڑی بہن ابی باجی، جنہوں نے میری کردار سازی کی اور آخر عمر میں میری ترقی دیکھی جو اماں نہیں دیکھ سکی تھیں۔

میری تینوں بہنوں کا یادگار گروپ فوٹو۔ دائیں جانب سے بڑی باجی فاطمہ بیگم، ابی باجی باقری بیگم اور چھوٹی باجی یوسف جہاں بیگم۔
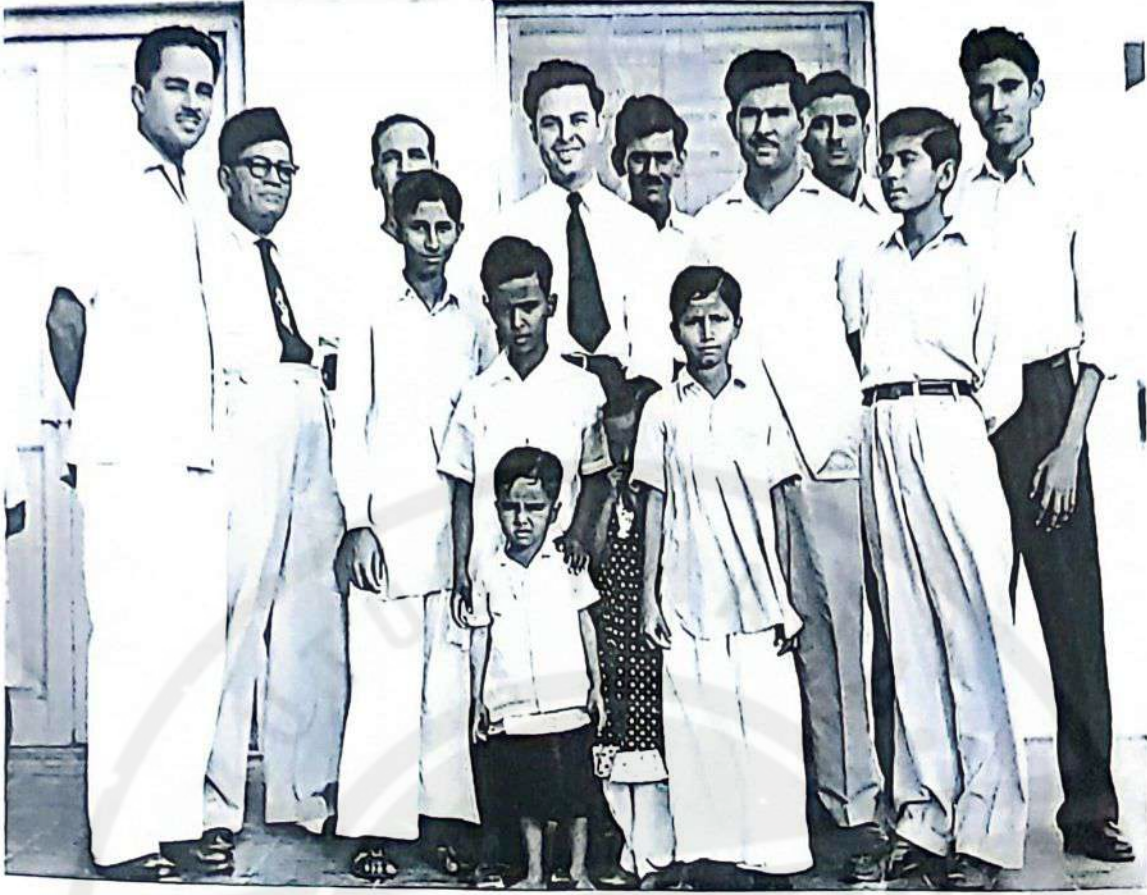
ابا کے ساتوں بیٹوں کی واحد یادگار تصویر۔ دائیں سے: رضا علی، مہدی علی، مصطفٰی علی، سرور علی، سیاہ ٹائی میں مرتضٰی علی، جناح کیپ میں حسن علی اور آخر میں اصغر علی عابدی۔
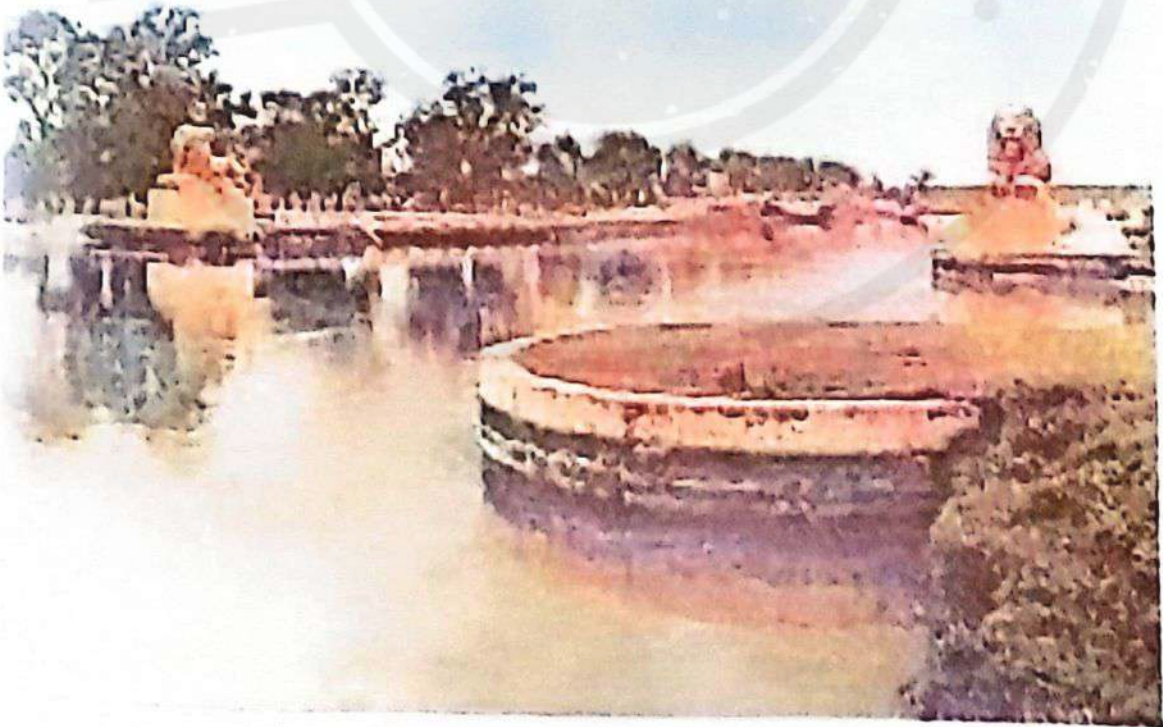
روڑکی کی دلکش نہر جس کے کناروں پر ایک ایک شیر بیٹھا ہے بالکل ایسے ہی شیر لندن کے ٹریفلگر اسکوئر میں بیٹھے ہیں۔

روڑکی کی نہر کا معمار کاٹلی جس کا مجسمہ آج بھی شہر میں نصب ہے۔
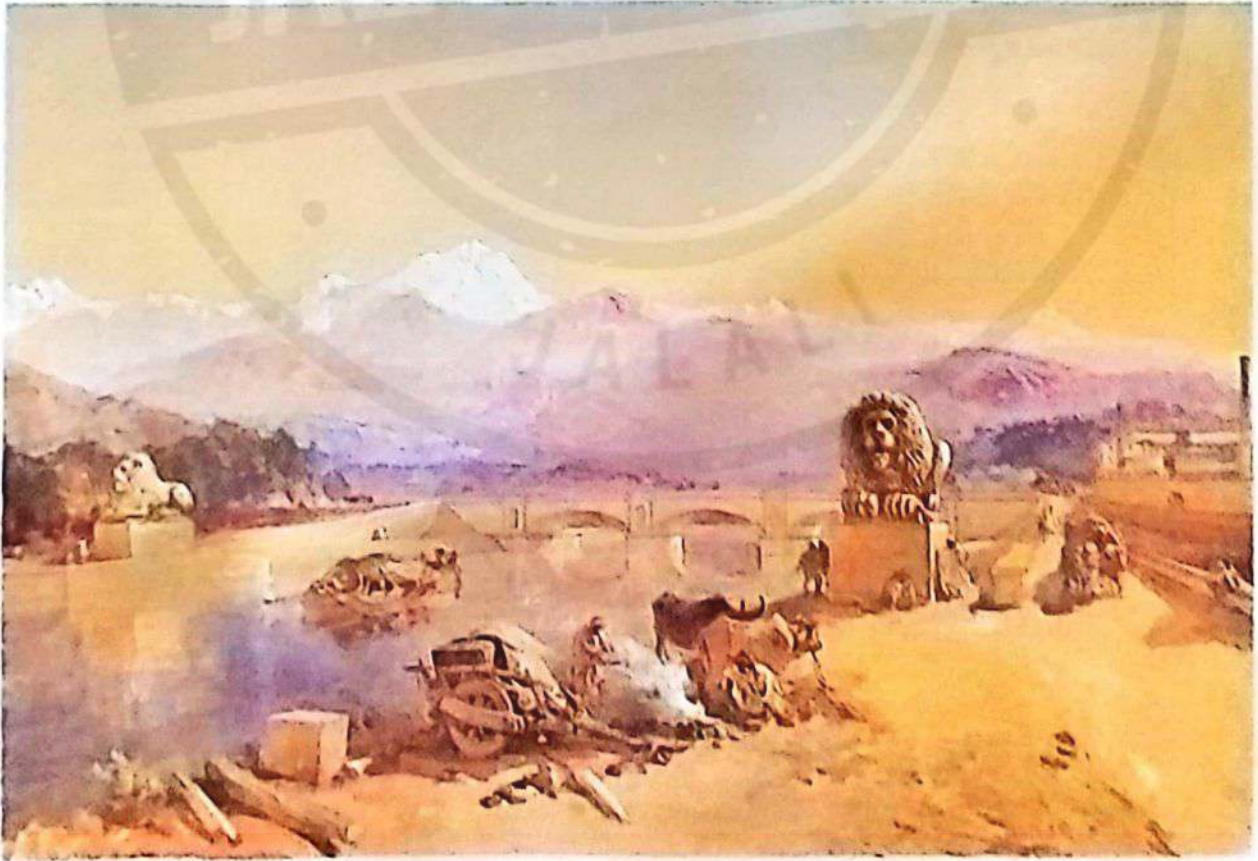
کسی انگریز مصور کی بنائی ہوئی قدیم روڑکی کی تصویر، پس منظر میں ہمالیہ کے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔
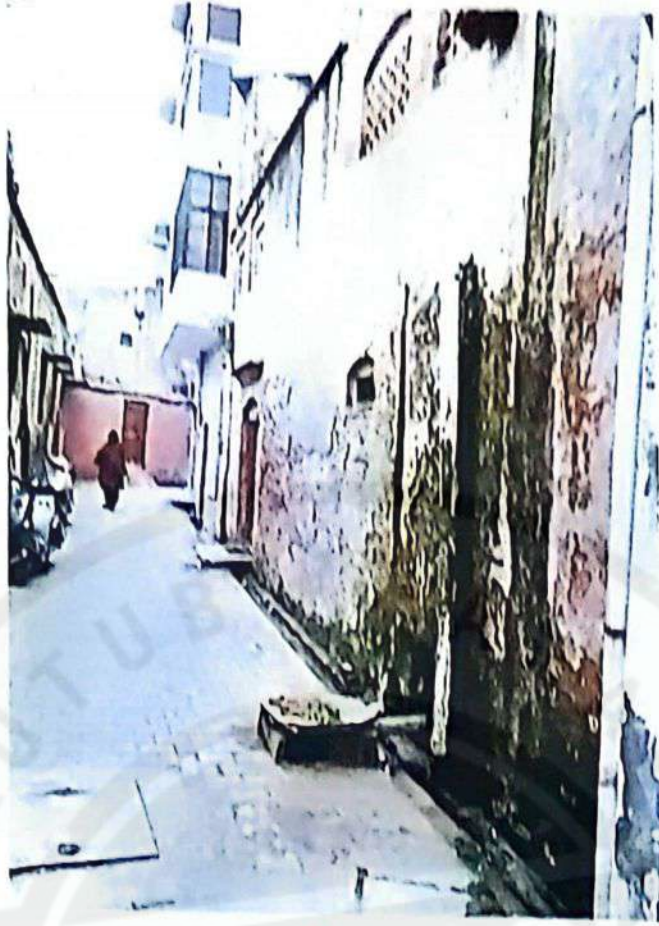
میرے گھر کی گلی میں نے جس میں ہوش سنبھالا اور پہلی بار گلی ڈنڈا کھیلا۔ اب نوّے سال پرانی ہونے والی ہے۔
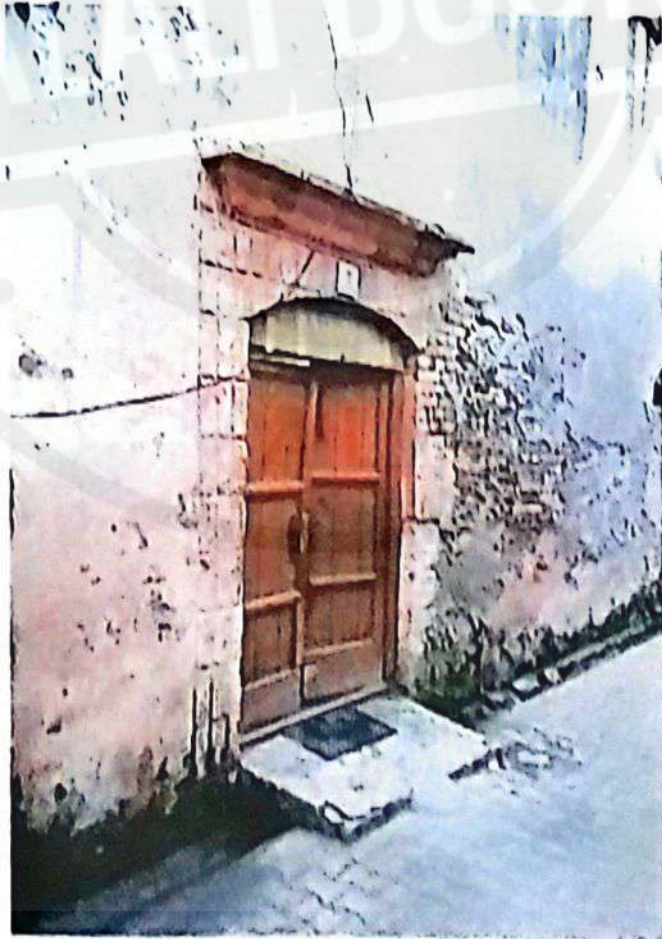
میرے گھر کا دروازہ، وہی اسی زمانے کی نشانی جس کے راستے نوّے سال تک آنا جانا لگا رہا۔
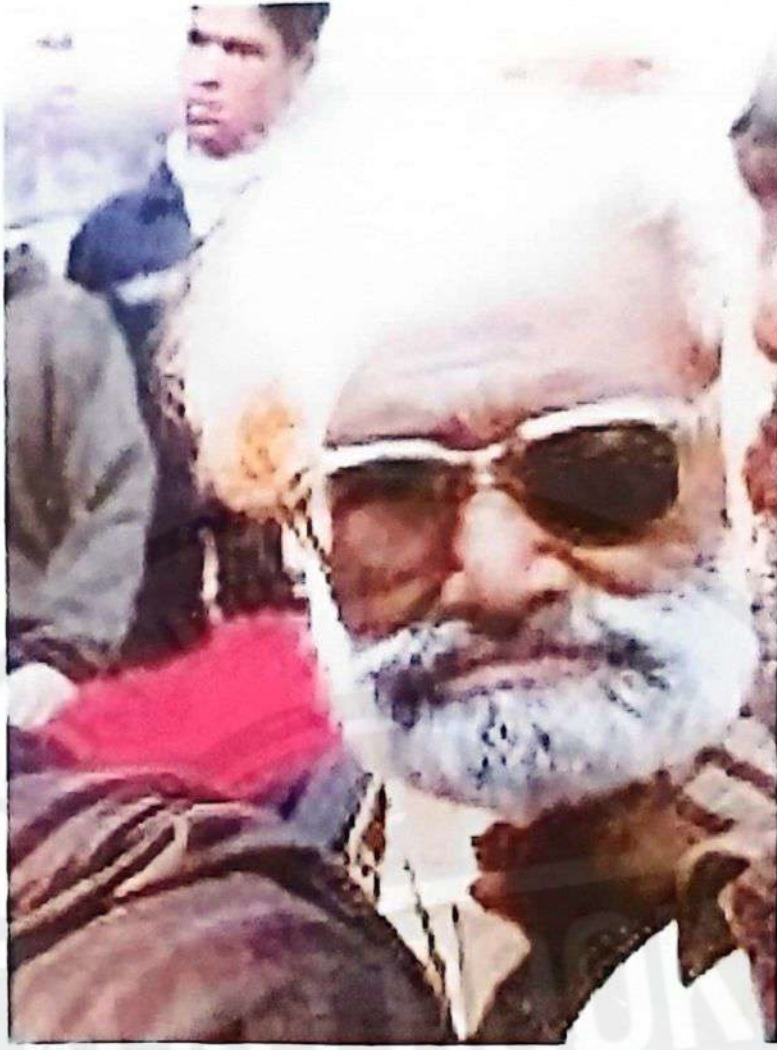
میرا بچپن کا ساتھی ننھو، جو میرے ساتھ ہر کھیل میں شریک رہا، عرصہ ہوا چل بسا۔

روڑکی میں انجینئرنگ کا شاہکار، سولانی ندی کا پُل جس کے نیچے ندی اور جس کے اوپر نہر بہتی ہے۔

میں ۳۵ برس بعد روڑ کی گیا تو ہمارے گھر دودھ لانے والے یونس حلوائی اور بچپن کا ہمجولی نھو مجھ سے ملنے آئے۔ یونس حلوائی کے بیٹے محمود علی اب بھی مجھ سے رابطے میں ہیں۔

میرے والد میر اکبر علی عرف پیارے صاحب۔ یہ شاید ان کے کالج کے زمانے کی تصویر ہے۔ میں نے ابا کو اس حلیۓ میں کبھی نہیں دیکھا۔

ہمارے کنبے کی یادگار تصویر۔ دائیں جانب سے بیٹھے ہوئے: مصطفیٰ علی، ان کی اہلیہ جمیلہ بیگم، میری اماں محمودہ بیگم، بھاوج قمر النسا جولی اور ان کے شوہر اصغر علی عابدی۔
(کھڑے ہوئے) رضا علی، سرور علی، یوسف جہاں بیگم، مرتضیٰ علی اور مہدی علی اقبال۔ سنہ ۱۹۶۵ کے آس پاس۔
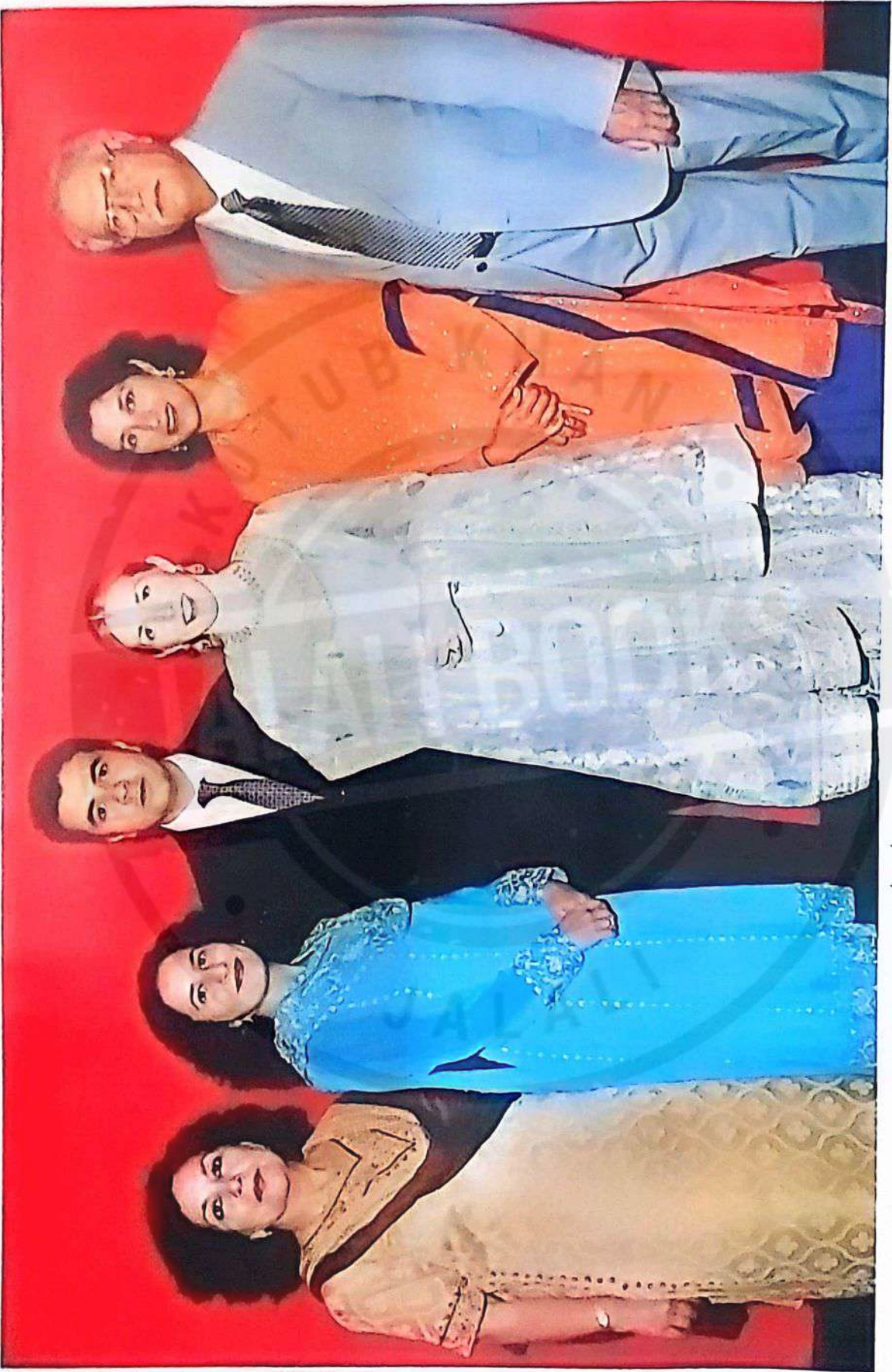
میرا اپنا کنبہ۔ دائیں جانب سے: رضا علی، میری بیٹی رباب، بہو حیدر۔ بیٹا بابر علی، بیٹی مونا اور اہلیہ ماہ طلعت عابدی۔
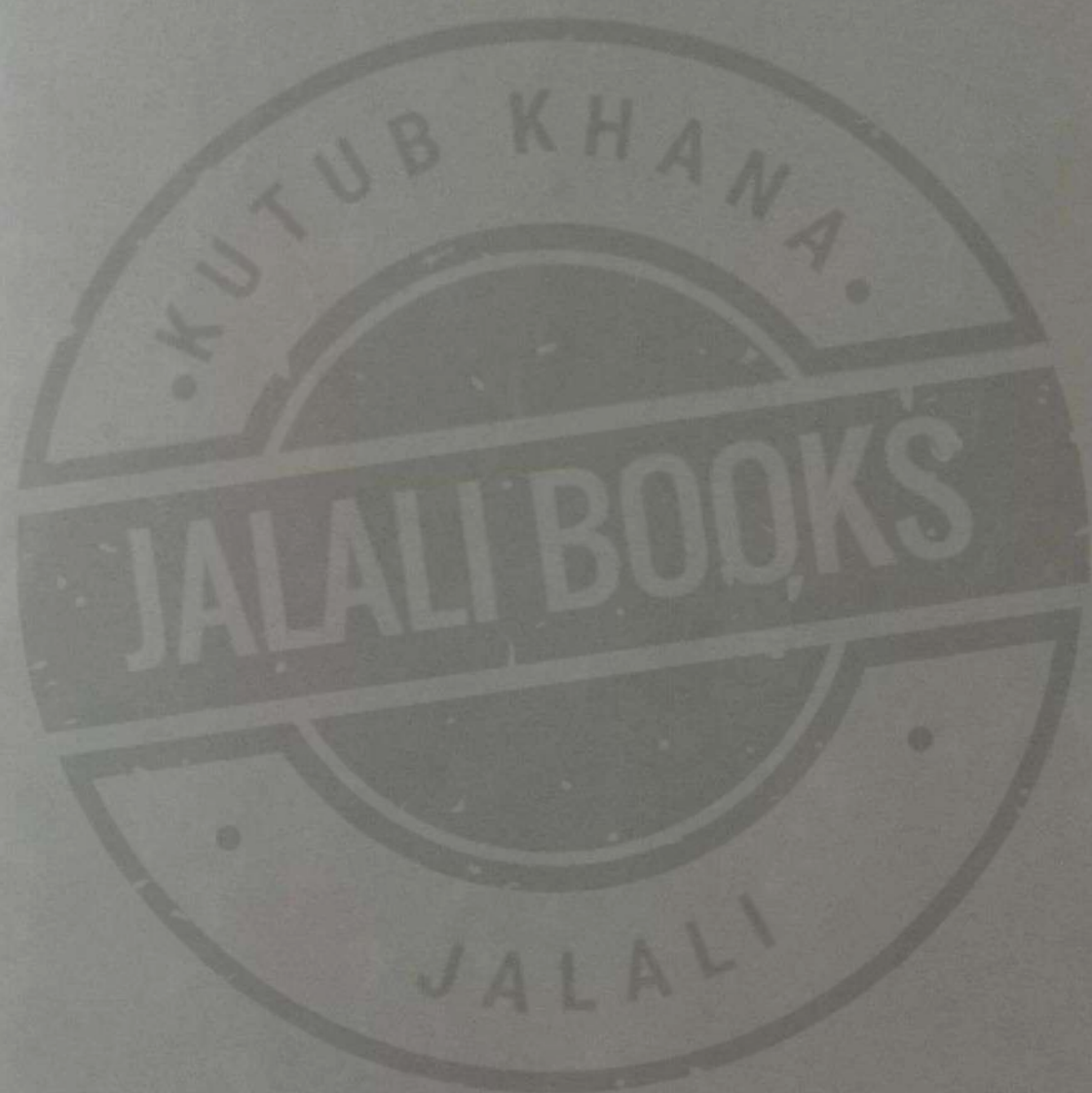
ایک بیگم اور ایک شاہ کا قصہ
تاریخ کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی جاگیر

سردھنا

میرٹھ کے قریب قصبہ کتانہ سے ایک بیوہ ماں نے سوتیلے بیٹوں کے رویّے سے تنگ آ کر چھ برس کی بیٹی فرزانہ کی انگلی پکڑی اور مقدر کی اس پگڈنڈی پر چل پڑی جس پر آگے چل کر کمسن لڑکی کو سردھنا نامی ایک بڑی جاگیر کی مالک اور ایک یورپی طرز کی بے حد تربیت یافتہ فوج کی کمانڈر بننا تھا۔ یہاں تک کہ مغل بادشاہ اور کمپنی بہادر کو اس سے مدد کی درخواست کرنا پڑی تھی۔ میدان جنگ میں وہ گھوڑے کی پشت پر یا ڈولے میں بیٹھ کر اپنی فوجوں کو آگے بڑھاتی تھی۔ نوّے برس کی عمر پا کر اس نے موت سے شکست کھائی اور وہ اپنے پیچھے بے شمار داستانیں اور بے پناہ دولت چھوڑ کر مری (۱۸۳۶ء)۔ دنیا نے اسے بیگم سمرو کے نام سے یاد رکھا۔ نئی تصنیف میں ہم اس کی کہانی کہیں گے۔

اور پھر یہ ہوا کہ ہم بیگم سمرو کا بنایا ہوا اطالوی طرز کا گرجا گھر دیکھنے سردھنا پہنچے تو پتہ چلا کہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ایک اونچی چار دیواری کے بڑے سے آہنی پھاٹک پر دستک دے کر ہم جو ایک احاطے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ محلوں جیسی عمارتوں کے کھنڈر کھڑے ہیں۔ وہیں ایک بزرگ کا مقبرہ موجود ہے اور اس میں مدفون بزرگ کوئی اور نہیں، افغان سردار سید محمد شاہ عرف جاں فشاں خان ہیں جنہوں نے پہلی افغان جنگ اور اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت میں جان پر کھیل کر انگریزوں کی مدد کی تھی جس کے صلے میں انہوں نے جاں فشاں خان کو سردھنا کی گنگا جمنی املاک عطا کر دی۔ آج ان کی اولادیں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور کئی ایک نے نام بھی پایا ہے۔

رضا علی عابدی کی تازہ تصنیف میں تاریخ کے خشک مضمون میں داستان گوئی کے سارے رنگ بھرے ہیں۔

سردھنا کے نام سے یہ کتاب زیر اشاعت ہے۔

Rs. 400.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-3204-X
ISBN-13: 978-969-35-3204-3
9789693532043